بعد کتابی صورت میں شایع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں تغلق حکومت کے قیام سے لے کر اس کے خاتمہ تک کے عام واقعات و حالات اجمال کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے برسر اقتدار آنے کی روداد بھی بیان کی گئی ہے، اور اس کے اور دوسرے تغلق سلاطین کے علمی و ادبی ذوق اور علم و ادب کی سرپرستی، نیز سیاسی، تاریخی اور تمدنی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، اسی باب میں عہد تغلق کی خودمختار ریاستوں کا ذکر بھی ہے، دوسرے باب میں تغلق سلاطین کے دور کے مذہبی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں علماء اور مذہبی طبقوں سے ان کے تعلقات کا خاص طور پر تذکرہ ہے، تیسرا باب تصوف پر لکھی جانے والی اس دور کی اہم کتابوں کے تعارف و تبصرہ کے لیے خاص ہے، اس ضمن میں متعدد کبار صوفیہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسروؒ، شیخ حسن سنجریؒ، برہان الدین غریبؒ، شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حمید قلندرؒ، امیر خوردؒ، شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ، ضیاء الدین نخشبیؒ، اور سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ وغیرہ کا تذکرہ بھی قلمبند کیا ہے، اور ان کی تصنیفات اور مجموعۂ ملفوظات پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے، چوتھے باب میں فارسی کی اہم نثری تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے، اور پانچواں باب اس عہد کی شاعری کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں اہم شعری مجموعوں کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، چھٹے باب متفرقات میں مختلف عمارتوں کے کتبات پر درج اشعار نقل کیے گئے ہیں، یہ کتاب عہد تغلق میں فارسی زبان و ادب کی نمایاں اور اہم خدمات کا مرقع ہے، لائق مصنف نے اس دور کے اکابر صوفیہ، ممتاز نثر نگاروں اور مشہور شعراء کے حالات و کمالات کا مختصر خاکہ بھی دیا ہے، اور ان کی اہم مصنفات و کتب پر تبصرہ کر کے ان کی قدر و قیمت اور اہمیت بھی دکھائی ہے، اس سے دور تغلق کے عام علمی، تعلیمی اور سیاسی و تمدنی حالات کے علاوہ گوناگوں قسم کے مفید معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، یہ کتاب مصنف کی تلاش و محنت اور فارسی زبان و ادب سے دلچسپی اور شگفتگی کا نتیجہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

نوٹ: معارف کا زر سالانہ اور ڈرافٹ یا چیک دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے روانہ فرمائیں۔

"منیجر"

شذرات

یہ معلوم کرکے بڑا دکھ ہوا کہ پٹنہ میں تحفظ شریعت کے پُرامن جلوس پر نہایت بے رحمانہ فائرنگ کی گئی جس سے بہت سارے لوگ زخمی ہوگئے، اس وقت ملک کے طول و عرض میں مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں جلسے، جلوس اور مظاہرے ہو رہے ہیں، اس سے اس بارے میں مسلمانوں کی غیر معمولی تشویش، اضطراب، نازک احساس، ملی بیداری اور دینی حمیت کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی بہت خوش آیند پہلو ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمان متحد ہیں، ایک ہی جلسہ میں ان کے مختلف الخیال افراد دوش بدوش شرکت کرتے ہیں، اور ایک ہی پلیٹ فارم سے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے نمایندے خطاب کرتے ہیں۔

وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے ۳؍دسمبر کو نئی دہلی میں آل انڈیا مومن کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ "ان کی حکومت کسی ایسے قانون پر نظر ثانی کی مخالف نہیں ہے جو کسی مذہبی گروہ کے پرسنل لا سے ٹکراتا ہو، موجودہ قوانین کی تیاری اس احتیاط کے ساتھ کی گئی ہے کہ ان سے کسی فرقہ کے پرسنل لا کی خلاف ورزی نہ ہو" وزیر اعظم نے اپنی حقیقت پسندی کی بنا پر ہندوستانی سماج کو مختلف اکائیوں پر مبنی ایک دولت مشترکہ بتایا، اور کہا کہ ان تمام اکائیوں کی اپنی بنیادی خصوصیات کا احترام کیا جانا چاہیے، مسلمانوں کی جانب سے ان کے بیان کا عام طور پر خیر مقدم کیا جا رہا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے وزیر اعظم کی اس یقین دہانی پر اطمینان ظاہر کیا ہے، اور اس کی مجلس عاملہ نے بھی اسے حکومت کے اب تک کے تمام بیانات سے بہتر اور واضح بتایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ وزیر اعظم کے اس حوصلہ افزا بیان سے مسلمانوں کی بے چینی اور بے اطمینانی میں کمی ہوئی ہے، اور حکومت کے رویہ کے بارے میں جو شکوک و شبہات ظاہر کیے جا رہے تھے، وہ بھی ایک حد تک رفع ہوئے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں مسلمانوں کو مکمل اطمینان اسی وقت ہوگا جب ایسی کارروائی عمل میں لائی جائے جس سے آیندہ اس قسم کے عدالتی فیصلہ کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے، اور اس کی صورت یہی ہے کہ حکومت کسی پس و پیش کے بغیر جلد از جلد سی۔ آر۔ پی۔ سی کی دفعہ ۱۲۵، اور دستور ہند کے رہنما اصول کے آرٹیکل ۴۴ میں ترمیم کر دے، یا مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دے، تاکہ اس طرح کے خدشات کا ہمیشہ کے لیے سدباب ہو جائے، اسی مقصد سے لوک سبھا میں مسلم لیگ کے ممبر مسٹر بنات والا نے ایک ترمیمی مسودہ قانون بھی پیش کیا ہے، جس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا، لیکن اب یہ بحث ۲۰؍دسمبر تک کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔

وزیر اعظم کو دونوں ایوانوں میں بھاری اکثریت حاصل ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے یہ صحت مند جمہوری روایت قائم کی ہے کہ وہ اہم قومی و بین الاقوامی معاملات پر اپوزیشن پارٹیوں سے بھی رائے و مشورہ کرتے ہیں، ان کی نیک نیتی سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ اہم امور و مسائل میں حکومت اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان اتفاق رائے ہو جائے، چنانچہ اس معاملہ میں بھی انھوں نے مخالف پارٹیوں کو اعتماد میں لینے کے لیے جب ان سے مشورہ کیا تو توقع کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی اور دونوں کمیونسٹ پارٹیوں نے سخت مزاحمت کی، اور مشترکہ سول کوڈ کو ملک کے تمام فرقوں کے لیے ضروری قرار دیا، اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کی شدید مخالفت کی۔

دراصل اس معاملہ میں وزیر اعظم کو مخالف پارٹیوں سے رائے و مشورہ لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے، یہ تو مسلمانوں کا داخلی معاملہ ہے، اس لیے اس میں تمام تر انہی کے احساسات و جذبات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، بہار کے ایک سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مسرا نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ "مسلم پرسنل لا قطعی طور پر مسلمانوں کا داخلی معاملہ ہے، اس میں عورتوں کے تحفظ کا خاص خیال رکھا گیا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی بھی اقدام اور فیصلہ خود مسلمانوں ہی پر چھوڑ دیا جائے اور جو رائے مسلمانوں کی ہو اسی پر عمل کیا جائے، اور اس میں کسی دوسرے کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا داخلی ہی نہیں، ایک مذہبی معاملہ بھی ہے، اس لیے اگر مسلمان بھی اس میں کسی قسم کی ترمیم کے خواہشمند ہوں جب بھی کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی، کیونکہ کتاب و سنت سے ثابت شدہ احکام میں کسی ترمیم و تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہمیں وزیر اعظم سے ان کے اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر یہی توقع ہے کہ وہ اس معاملہ میں کسی لیت و لعل کا شکار ہونے کے بجائے سراسر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں گے، مخالف پارٹیوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس معاملہ کی نزاکت و شدت کو محسوس کریں اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل در معقولات سے باز رہیں، ملک کے اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی مناسب و معقول ضمانت دی جائے، اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

حضرت مولانا شاہ ہدایت علی ؒ جے پور (راجستھان) کے ایک عالم ربانی اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے صاحب کمال

شیخِ طریقت تھے، ان کی ذات سے مدتوں رشد و ہدایت کا چراغ روشن رہا، اور اس علاقہ کے لوگوں کو بڑا فیض پہونچا، انھوں نے چند تصنیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اردو ترجمہ "درلاثانی" بھی ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے سعادت مند پوتے مولانا محمد عبد الرحیم صاحب ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں، ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمانہ کے حالات و مسائل اور وقت کے تقاضوں سے بھی باخبر ہیں، اس لیے مسلمانوں میں دینی تعلیم کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کو بھی فروغ دینے کے لیے انھوں نے جامعۃ الہدایۃ کی داغ بیل ڈالی ہے، جس کا سنگ بنیاد ۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دست مبارک سے رکھا گیا تھا، اور اب ۹ برس بعد پھر ان ہی کی صدارت میں ۸ دسمبر کو جامعہ کے جشن افتتاح کی شاندار تقریب ہوئی، جس میں ملک کے دوسرے حصوں کے اصحاب علم کے علاوہ جناب اے۔ یو۔ شیخ، ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس، ایم پی جے پور کے ممبر پارلیمنٹ اور مرکزی وزیر مسٹر نول کشور شرما، راجستھان ہائی کورٹ کے دو جج صاحبان بھی شریک ہوئے اور جلسہ کو خطاب کیا، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علم و تعلیم کے موضوع پر بڑی پُرمغز اور موثر تقریر فرمائی۔

اسی روز شب میں سیرت کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا سید محمد سلمان حسینی ندوی، اور صدر جلسہ مولانا حکیم مفتی احمد حسن خاں صاحب (جے پور) کی تقریریں ہوئیں، دوسرے دن ۹ دسمبر کو مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی چیرمین اترپردیش اردو اکاڈمی کی صدارت میں مقالات کا جلسہ ہوا، جس میں راقم الحروف، مولانا ابوالعرفان ندوی (ندوۃ العلماء) جناب منظور احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اور صدر جلسہ نے مضامین پڑھے، اور جناب سید محمد ہاشم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے تقریر کی، یہ پروگرام بھی بہت کامیاب رہا، دونوں جلسوں کا اختتام مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب کی تقریر و دعا پر ہوا، وہ بڑے خاموش مگر نہایت عملی اور مخلص شخص ہیں، انھوں نے جے پور شہر سے آٹھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر رام گڑھ روڈ کے دونوں جانب جامعۃ الہدایۃ کے لیے تقریباً دو سو ۲۰۰ ایکڑ زمین حاصل کر لی ہے جس پر مین بلڈنگ اور ہوسٹل کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے لیکن ابھی بہت سارے منصوبے زیر تکمیل ہیں، جو ان شاء اللہ مولانا عبد الرحیم صاحب اور ان کے رفقاء کی سرگرمی، اخلاص اور ایثار کی بدولت ضرور پایۂ تکمیل کو پہونچیں گے۔

مقالات

اسلامی علوم و فنون اور مستشرقین یورپ

از۔ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

یہ مضمون تقریباً پون صدی پہلے علامہ شبلیؒ کی زندگی میں لکھا گیا تھا، اور اپریل ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں چھپا تھا، اس موقع پر پھر اس کی اشاعت مناسب ہوگی۔ (معارف)

اس وقت یورپ اس قدر متمدن دنیا پر چھایا ہوا ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں یورپ نے مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، اپنی زبان میں اسلامی علوم و فنون کے ترجمے کیے تھے، تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے، بلکہ اس کو مبالغہ سمجھتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کو ابتدا ہی سے مسلمانوں سے علمی تعلقات پیدا ہو گئے تھے، آٹھویں صدی عیسوی میں جب کہ تمام یورپ جہالت، تعصب، توہمات اور خرافات کا مرکز بنا ہوا تھا، مسلمانوں کی علمی و تمدنی ترقی کا عنفوانِ شباب تھا، بغداد میں حکماء، فلاسفر، شاعر، متکلم سب کے سب علمی ترقی میں مصروف تھے، ہارون رشید کا قصر خلافت علوم و فنون کی اکاڈمی بنا ہوا تھا، اس ترقی کی شہرت کی بنا پر اکثر سلاطین وقت ہارون رشید سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہتے تھے، انہی میں ایک شارلیمان بھی تھا، یہ اگرچہ اپنی ملکی وسعت کے لحاظ سے بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا، پھر بھی علمی و تمدنی حیثیت سے اس کو یورپ اور اسلامی ملکوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا، یورپ میں اس وقت صرف مذہبی تعلیم جاری تھی اور وہ بھی صرف گرجوں تک محدود تھی، اس تعلیم کے ذریعہ خرافات، واوہام کی تلقین کیجاتی تھی، شارلیمان پہلا شخص ہے جس نے اس دماغی تنزل کو محسوس کیا، اور خلیفۂ اسلام ہارون رشید کی تقلید میں اپنے دربار میں علماء، حکماء، اور

شعراء کو جمع کیا، ان میں کوئین سب سے زیادہ نامور ہے، یہ شاعر بھی تھا، اور عالم بھی، اس نے خود عربوں سے یا ان یہودیوں سے جنھوں نے عرب علماء سے تعلیم حاصل کی تھی، اسلامی علوم وفنون پڑھے تھے، عبرانی اور لاطینی زبانوں کا بہت بڑا ماہر تھا، اس کے ذریعہ یورپ میں علمی دور شروع ہوا۔

یورپ میں اگرچہ اس سے بہت پہلے مسلمانوں کا علمی وتمدنی اثر قائم ہوچکا تھا، مسلمان پہلی ہی صدی میں جنوبی فرانس میں اقامت گزیں ہوگئے تھے، انھوں نے پورے یورپ میں آزادی وحریت کی روح پیدا کردی تھی، لیکن کلیسا کی سخت گیریاں بھی قائم تھیں، اس لیے وہاں کوئی آزادانہ صدا بلند نہیں ہوسکتی تھی، پھر بھی شارلیمان نے روشن خیال علماء کی مدد سے تمام گرجوں میں مذہبی علوم کے ساتھ موسیقی، ہندسہ، نجوم اور منطق وغیرہ کی کتابیں داخل نصاب کیں، لیکن شارلیمان کے بعد اس کی علمی اصلاحات کا خاتمہ ہوگیا، اور کلیسا کی جابرانہ حکومت پھر قائم ہوگئی اور وہ ان اصلاحات کو گوارا نہیں کرسکتا تھا، شارلیمان کے پوتے شارل نے نویں صدی میں جب اپنے دادا شارلیمان کے نقش قدم پر چلنا چاہا، اور ایک انگریز عالم سے جو عبرانی، یونانی، عربی زبانوں اور طب اور فلسفہ کا بڑا ماہر تھا، مسلمانوں کے علوم وفنون کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی خواہش کی تو اس سے تمام یورپ گونج گیا، اور کلیسا نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا، تاہم ان رکاوٹوں کے باوجود آزادی کی روح برابر ترقی کرتی گئی، اور جب اندلس میں مسلمانوں نے اپنے عظیم الشان مدارس قائم کیے اور وہ تمام دنیا کی علمی ترقیوں کا کعبۂ امید بن گیا، تو اس کا اثر یورپ پر پڑے بغیر نہیں رہا، چنانچہ بہت سے لوگوں نے مسلمانوں کے ان مدرسوں میں علوم وفنون حاصل کیے جن میں ایک جربرٹ بھی تھا، جو نویں صدی کے آخر میں پوپ ہوگیا تھا، اس نے اسلامی علوم وفنون کے تراجم کو اس قدر وسعت دی کہ یورپ میں علمی بہار آگئی، لیکن خود یہاں کے لوگوں نے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کے لیے کوئی مدرسہ قائم نہیں کیا تھا، شارلیمان نے قائم کرنے کی کوشش کی، تو کامیاب نہیں ہوا، فریڈرک ثانی پہلا شخص ہے، جس نے یورپ میں اسلامی علوم وفنون کے مدارس قائم کیے، فریڈرک ثانی ۲۶ دسمبر ۱۱۹۴ء

میں پیدا ہوا، اور بلرم میں تعلیم وتربیت پائی، بلرم اس وقت عرب حکماء سے بھرا ہوا تھا، اس بنا پر اس کو ابتدا ہی سے بے تعصبی کے ساتھ علمی ذوق کو ترقی دینے کا موقع ملا، اس کی بے تعصبی کا اظہار اس کے علمی کارناموں ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ذاتی زندگی بھی اس کا بہترین مظہر تھی، چنانچہ اس کے باڈی گارڈ مسلمان ہوتے تھے، اس نے جو قلعے اور عمارتیں تعمیر کرائی تھیں، ان میں اندلس کی عمارتوں کی طرح عربی طرز تعمیر کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا، پھر خوش قسمتی سے بے تعصبی سے کام لینے کے لیے زمانہ نے پہلے ہی سے اس کے لیے راستہ صاف کردیا تھا، چنانچہ جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا، اور فرانس میں داخل ہوئے تو آزاد خیالی اور لٹریچر نے فرانس پر بھی بہت نمایاں اثر ڈالا، بالخصوص شاعری پر اس کا خاص اثر پڑا، فرانس کے شعراء پہلے جو اشعار کہتے تھے، ان میں قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی تھی، لیکن عرب شعراء کی تقلید اور تتبع میں وہ بھی قافیہ کی پابندی کرنے لگے، خود عربی اشعار اور رجز وہاں کے لوگوں کی زبانوں پر اس قدر چڑھ گئے کہ وہاں کے فقراء عربی اشعار پڑھ پڑھ کر بھیک مانگتے تھے، صلیبی لڑائیوں نے بھی مسلمانوں کے شاندار تمدن وتہذیب کا جو نمونہ یورپ کے سامنے پیش کیا تھا، اس نے بھی اچھا خاصا اثر ڈالا، اور یورپ کے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔

جب اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور ان کے بڑے بڑے شہر عیسائیوں کے قبضہ میں آگئے، تو مسلمان وہاں سے نکل کر جنوبی فرانس میں پھیل گئے، مسلمانوں کے اس انتقال مکانی سے مونپلیہ یونیورسٹی پر خاص اثر پڑا، اہل یورپ نے مونپلیہ میں ایک طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، جب ان کو اندلس کے عرب علماء سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، تو یہ مدرسہ مذہبی اور علمی آزادی فکر کے لحاظ سے تمام یورپ کی دماغی ترقی کا مرکز بن گیا،

سسلی کو بھی جب مسلمانوں نے فتح کیا تو اس پر بھی ان کے تمدن کا رنگ چڑھ گیا، سسلی چونکہ وسط یورپ میں واقع تھا، اس بنا پر یورپ کی مختلف قومیں اسی رنگ میں رنگ گئیں، نورمانیوں نے

جب سسلی کو فتح کیا، تو یہاں کے تمدن میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس زمانہ میں مسلمان علمی دائرے سے نکل کر سیاست کے میدان میں بھی آگیے، خصوصاً فوجی اور انتظامی معاملات میں ان پر پورا بھروسہ کیا جاتا تھا، جنگی جہاز تو بالکل ان کے ہاتھ میں تھے، ان کے اثر سے جہاز سے متعلق بہت سے الفاظ اور اصطلاحات یورپ کی زبانوں میں آگیے، جو اب تک موجود ہیں، مثلاً امیرال یورپ کی کی زبانوں کا ایک متداول لفظ ہے، حالانکہ یہ لفظ امیر البحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے، بہر حال سسلی کے شہروں سے لیکر دہات تک میں عربی تمدن کا اثر نمایاں تھا، خصوصاً اوس کے دو شہر بلرم اور سالرن تو عربی تمدن کا مرکز تھے۔

ان تمام قدرتی اسباب سے فریڈرک ثانی کو فائدہ اٹھانے کا خوب موقع ملا، چنانچہ اوس نے دو عظیم الشان مدرسوں کی بنیاد ڈالی، ان میں پہلا مدرسہ نابولی کا ہے، فریڈرک نے اس میں وہاں کے مقامی علماء کے علاوہ عرب پروفیسر بھی مقرر کیے، کتب خانوں سے بھی اوسکو مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے، چنانچہ اوس نے مصر، اندلس، شام اور گرجوں کے تمام کتب خانوں کو ملا کر ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، نابولی بحر متوسط کے وسط میں تھا، اس بنا پر یورپ بر اعظم یورپ کے تمام اطراف و جوانب سے نہایت کثرت سے طالب العلم آتے تھے، اور تعلیم حاصل کرتے تھے، غربار کو مفت تعلیم دی جاتی تھی، سالرن کا مڈیکل کالج بہت وقیع اور بلند تھا، اوس کے مقابلہ میں نابولی کا مدرسہ کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، سالرن کے اس کالج کو سب سے پہلے آٹھویں صدی میں بعض عرب اور یہود علمار نے قائم کیا تھا، لیکن اس کی اصلی ترقی فریڈرک ثانی کے عہد میں ہوئی، اس میں اس وقت کی تمام مروجہ زبانوں مثلاً لاطینی، یونانی، جرمن، عربی، عبرانی میں تعلیم دی جاتی تھی، تاکہ کسی زبان کا جاننے والا بھی تعلیم سے محروم نہ رہے، تعلیم کا طرز یہ تھا، کہ تمام علوم و فنون پر لکچر دیے جاتے تھے، علم التشریح کی بھی تعلیم ہوتی تھی، چونکہ عیسائی مردہ آدمیوں کے جسموں کو چھونا ناجائز سمجھتے تھے،

اس لئے اس قسم کے تجربات بجائے انسانی جسموں کے بندروں کے جسموں پر کیے جاتے تھے، جو تمام جانوروں میں انسانوں سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں، لیکن کبھی کبھی پوشیدہ طور پر انسان کے جسم کی بھی تشریح کیجاتی تھی، داخلہ کے لیے کسی خاص مذہب کی قید نہ تھی، ہر مذہب کے اساتذہ بھی اس میں رکھے جاتے تھے، اور ہر مذہب کے طلبہ بھی اس میں داخلہ لے سکتے تھے۔

اس مڈیکل کالج میں خاص طور سے ہر مرض کے اسپشلسٹ بھی تیار کیے جاتے تھے، بعض صرف آنکھ کے امراض کا علاج کرتے تھے، بعضوں کو مثانہ کے امراض میں کمال ہوتا تھا، بعض صرف نباتات کے خواص کی واقفیت رکھتے تھے، ان کے تمام تجربات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیے گیے ہیں، جن کا نام رجمین سنیٹیٹس ہے، محققین کا بیان ہے کہ یہ کتاب اسحاق بن سلیمان کے تجربات سے ماخوذ ہے، جو قرطبہ کا مشہور حکیم تھا، اس کتاب میں امراض کی تشخیص، اعضاے انسانی کی تشریح، اصول حفظان صحت، کواکب کا تعلق صحت و مرض کے ساتھ، غرض اس قسم کے مفید مباحث درج ہیں، اس مدرسہ نے اس قدر ترقی کی، کہ خود حکومت نے عطاروں کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی، کہ وہ عطاری کے ساتھ طبابت نہ کرنے پائیں، جس سے خاص اطبار کے حقوق میں دست اندازی ہوتی تھی، اس مدرسہ کی سرپرستی میں متعدد شفاخانے قائم تھے، جن پر بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں، ان میں پہلا شفاخانہ خاص ان اصولوں کے مطابق قائم کیا گیا تھا، جو اندلس میں خلفاے بنی امیہ کے شفاخانوں کا سنگ بنیاد تھے، لیکن یورپ کو ان مدارس کے علاوہ مسلمانوں کی تصنیفات کے تراجم سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا، یورپ میں تراجم کا ذوق سب سے پہلے جربرٹ نے پیدا کیا، اور پھیلایا، جو ۹۹۹ء میں عیسائیوں کا سب سے بڑا پوپ گذرا ہے، اور جو پاپا سلوسٹر ثانی کے نام سے مشہور ہے، اس نے تراجم کی اشاعت میں ایسی سرگرمی دکھائی، کہ اہل یورپ نے اس پر یہ تہمت لگائی کہ اس نے اپنی روح شیطانوں کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، اس کے بعد ہرمان مقفع قسطنطین

افریقی، افلاطون طیبوری، اذلاو باطی، یوحنا شبیلی گوندیسالفی ہرمان الدلانی، مرقس طلیطلی، کریمونی، فیلنوف، ارمنگو، اسکاٹ، فراغوٹ غرض کہ نہایت کثرت سے مترجمین پیدا ہو گئے، ان مترجمین میں اگرچہ اٹالین، فرانسیسی، اور انگریز سبھی تھے لیکن عربی تصنیفات کا ترجمہ عموماً لیٹن زبان میں کیا جاتا تھا، ان مترجمین نے جن کتابوں کے ترجمے کیے، ان کی تعداد تقریباً ۳۰۰ تک پہنچی ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

علم	تعداد
فلسفہ و طبیعات	۹۰
ریاضی و نجوم	۷۰
طب	۹۰
کیمیا و نجامہ	۴۰

تراجم کا یہ ذوق روز بروز بڑھتا گیا، یہانتک کہ ۱۱۳۰ء میں لارڈ بشپ رائمونڈ کی سرپرستی میں طلیطلہ میں تراجم کا ایک خاص محکمہ قائم ہوا جس کے ذریعہ یورپ میں تراجم کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، ڈاکٹر لوکالک نے اپنی کتاب تاریخ علم طب عربی میں لکھا ہے کہ عربی کی صرف ۳۰۰ طبی کتابوں کا ترجمہ لیٹن زبان میں کیا گیا، پندرہویں صدی تک یورپ میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی، اور اس کی تمام دماغی ترقیوں کا دارومدار انہی تراجم پر رہا، ڈاکٹر گستاولی بان کا بیان ہے کہ یورپ میں چھ سو برس تک انہی تراجم کے ذریعہ سے تعلیم ہوتی رہی، بالخصوص طب میں ابن سینا کی تصنیفات اٹھارہویں صدی تک مونٹپلیہ کی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی تھیں،

عربی زبان سے جن کتابوں کا ترجمہ یورپ میں کیا گیا، ان کی دو قسمیں ہیں،

ایک تو وہ کتابیں ہیں، جن کو خود اہل عرب نے یونانی زبان سے ترجمہ کیا تھا، یورپ میں

اگرچہ ان کتابوں کا ترجمہ عربی تراجم کے ذریعہ ہوا، لیکن یہ کتابیں اصل مصنفین کی طرف منسوب کر دی گئیں، یہ کتابیں زیادہ تر ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس کی تصنیفات تھیں،

دوسری وہ کتابیں ہیں، جن کو ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خود علمائے اسلام نے تصنیف کیا تھا، ہم اس موقع پر ان مصنفین کی ایک فہرست درج کرتے ہیں جن کی تصنیفات کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا گیا۔

شمار	نام مصنف	کیفیت
۱	ابو الحسن فلکی	اس کی تمام تصنیفات علم الفلک میں تھیں، اس کی کتاب اوائل و اواخرہ کے بعض اجزا کا ترجمہ مورخ سیدیو نے کیا، اور ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا،
۲	ابو الوفا جوزجانی بتانی	یہ بہت بڑا ہیئت داں تھا، سیدیو نے اس کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کیا، اور یہ تمام ترجمے ۱۸۴۲ء میں پیرس سے شائع ہوئے۔
۳	یعقوب کندی	اس کی ایک طبی تصنیف کا لیٹن زبان میں ترجمہ ہوا، اور ۱۵۳۱ء اور ۱۶۰۳ء کے درمیان متعدد بار شائع ہوا،
۴	موسیٰ خوارزمی	اس نے جبر و مقابلہ میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا ترجمہ علامہ روزن نے ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان میں کیا، اس سے پہلے بارہویں صدی میں

نمبر شمار	مصنف	کیفیت
		علامہ رودولف دی بروج نے اس کا ترجمہ لیٹن میں کیا تھا۔
۵	ابوالحسن الفرغانی	اس نے علم الفلک میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے لیٹن میں تین ترجمے کیے گئے، ایک ترجمہ یوحنا اشبیلی نے بارھویں صدی میں کیا تھا، جو ۱۴۹۳ء میں فراری سے شائع ہوا، اور اخیر میں ۱۶۹۹ء میں بھی چھاپا گیا۔
۶	ابونصر فارابی	اس کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا لیکن ان کی اشاعت نہیں ہوئی۔
۷	ابن رشد	وہ طب، فلسفہ، ہیئت، تمام فنون کا جامع تھا، اس کی اکثر طبی تصنیفات کا لیٹن میں ترجمہ ہوا، اور ۱۵۵۲ء میں یہ تراجم مختلف عنوانات سے شائع کیے گئے،
۸	ابن سینا	قانون اس کی مشہور تصنیف ہے، لاطینی زبان میں یہ کتاب ترجمہ ہو کر بار بار چھپی، اسکی پہلی اشاعت مقام بندقیہ سے ۱۴۸۴ء میں ہوئی تھی، ابن سینا کی تصنیفات کی شرحیں تو اٹھارہویں صدی کے آخر تک شائع ہوتی رہیں،

شمار	مصنف	کیفیت
۹	قسطنطین افریقی	یہ وہ شخص ہے جس نے اٹلی میں عربی طب کو رواج دیا، اس نے اپنی تمام کتابیں لیٹن زبان میں لکھی تھیں جنکا ماخذ طب عربی تھی، یہ کتابیں ۱۵۳۶ء میں مقام بال سے شائع ہوئیں۔
۱۰	جابر بن حیان	کیمسٹری کا بہت بڑا عالم تھا، پیرس کے پبلک کتب خانہ میں لیٹن زبان میں اس کی چھ کتابیں موجود ہیں، اس کی اکثر کتابوں کی اشاعت ہوئی، سب سے پہلے اس کی کتابیں ۱۴۹۰ء میں چھاپی گئیں، اس کے بعد ۱۶۷۲ء میں لیٹن سے فرنچ میں انکا ترجمہ ہوا، اسکی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے ہوئے، اور ۱۶۶۸ء میں ان کی اشاعت ہوئی،
۱۱	جابر فلکی	یہ دوسرا شخص ہے، اشبیلیہ میں رہتا تھا، ہیئت میں اس نے ایک مفید کتاب لکھی تھی، جس کا لیٹن میں ترجمہ ہوا،
۱۲	عباس	اس نے طب میں پچاس اجزاء میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام مالکی تھا، لیٹن میں اس کا ترجمہ ہوا اور مقام ونیس سے ۱۴۹۲ء میں شائع ہوا،
۱۳	حسن بن الہیثم	یہ ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا، اس کی کتابوں کا لیٹن میں ترجمہ ہو کر ۱۵۷۱ء میں شائع ہوا، اس نے ہندسہ میں ایک کتاب لکھی تھی، سیدیو نے اس

شمار	مصنف	کیفیت
		کا خلاصہ شائع کیا۔
۱۴	ابن العوام اندلسی	علم النباتات کا ماہر تھا، اس نے فن زراعت پر ایک کتاب لکھی تھی، موسیو کلیمان مولیہ نے فرنچ میں اس کا ترجمہ کر دیا اور سنہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا،
۱۵	قزوینی	ہیئت، جغرافیہ، تاریخ طبیعی کا عالم تھا، اس کی کتاب عجائب المخلوقات کا فرنچ میں ترجمہ ہوا، اور سنہ ۱۸۰۵ء میں پیرس سے شائع ہوا، حال میں اس کے ہیئت کے ایک رسالہ کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔
۱۶	ضیاء ابن بیطار اندلسی	علم النباتات میں مہارت رکھتا تھا، اس کی ایک کتاب مفردات کا ترجمہ ڈاکٹر لوکلرک نے دو جلدوں میں کیا، اور سنہ ۱۸۷۷ء میں پیرس سے شائع ہوا۔
۱۷	ابن یونس	یہ ہیئت داں تھا، زیچ حاکمی جو ہیئت میں بے مثل تصنیف ہے، اس کی تالیف ہے، علامہ کوسان دو یہ سقال نے اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ کیا اور سنہ ۱۸۰۴ء میں پیرس سے شائع ہوا۔
۱۸	یحییٰ بن ماسویہ	بہت بڑا طبیب تھا، خواص ادویہ میں اس کی بہت سی کتابیں ہیں، جو بار بار چھپ چکی ہیں، لیٹن میں اس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور مقام بندقیہ سے سنہ ۱۲۷۱ء

شمار	مصنف	کیفیت
		میں شائع ہوا۔
۱۹	محقق طوسی	اس نے ایک زیچ مرتب کی تھی، اس کا خلاصہ لیٹن زبان میں سنہ ۱۶۴۳ء میں شائع ہوا، اور سنہ ۱۶۵۲ء میں بھی چھاپا گیا۔
۲۰	الغ بیگ	یہ تیمور لنگ کا پوتا اور ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے ایک زیچ مرتب کی تھی، . . . . ، جو اوسی کے نام سے مشہور ہے، لیٹن میں اس کا ترجمہ ہوا، اور سنہ ۱۶۶۵ء میں آکسفورڈ سے اور سنہ ۱۸۴۷ء میں پیرس سے اس کی اشاعت ہوئی،
۲۱	زکریا رازی	طبیب اور بہت بڑا مصنف تھا، اوس کی تصنیفات کی تعداد ۲۲۶ تک پہنچی ہے، اسکی اہم کتابوں کا لیٹن میں ترجمہ ہوا، اور سنہ ۱۴۸۶ء میں ان کی اشاعت ہوئی، چیچک کے متعلق اس کا ایک رسالہ تھا، جو سنہ ۱۷۴۵ء و سنہ ۱۷۶۶ء میں لیٹن زبان میں چھاپا گیا، آج تک علم کیمیا میں اس کی تین کتابوں کے ترجمے متداول ہیں۔
۲۲	ثابت بن قرہ	یہ پہلا شخص ہے کہ جس نے جبر و مقابلہ اور ہندسہ میں

شمار	مصنف	کیفیت
		تطبیق دی، سیدیو نے اس کی تصنیفات کا خلاصہ شائع کیا ہے۔

مصنفین کی صراحت کے ساتھ ہم ان تمام تصنیفات کی ایک مفصل فہرست درج کرتے ہیں۔ جن کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں ہوا، یہ فہرست اگرچہ جامع اور مکمل نہیں ہے، تاہم اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ یورپ کس قدر مسلمانوں کا گران بار احسان ہے۔

شمار	نام کتاب	مصنف	مترجم	شمار	نام کتاب	مصنف	مترجم
۱	السمع والبصر	یعقوب کندی	کریمونی	۱۲	العلوم	فارابی	کریمونی
۲	الغایہ	،،	،،	۱۳	العقل والمعقول	،،	نامعلوم
۳	الاحکام	،،	،،	۱۴	الکیمیا	،،	،،
۴	التوحید	،،	،،	۱۵	الحاوی	زکریا رازی	فراغوت
۵	الاسباب المختلفہ	،،	نامعلوم	۱۶	المنصوری	،،	کریمونی
۶	مستقبل المعرفہ	،،	،،	۱۷	الضوء	،،	،،
۷	خصائص العناصر	فارابی	،،	۱۸	الاجتمام	،،	،،
۸	السمع الطبیعی	،،	کریمونی	۱۹	المدخل فی الطب	،،	،،
۹	المنطق	،،	،،	۲۰	الاغذیہ	،،	،،
۱۰	مطلع العلم	،،	کندیانفی	۲۱	علل المفاصل	،،	نامعلوم
۱۱	اقسام الفلسفہ	،،	،،	۲۲	امراض الجلد	،،	،،

شمار	کتاب	مصنف	مترجم	شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۲۳	التریاق	زکریا رازی	نامعلوم	۴۱	الکلیات	ابن رشد	ارمنکو
۲۴	الجدری والحصبہ	،،	،،	۴۲	شرح ارجوزہ ابن سینا	ابن رشد	،،
۲۵	القانون	ابن سینا	کریمونی	۴۳	الادویۃ المفردہ	ابن سینا	مائن
۲۶	قلب الانسان	،،	فیلنوف	۴۴	التریاق	،،	نامعلوم
۲۷	الارجوزہ فی الطب	،،	ارمنکو	۴۵	السموم	،،	،،
۲۸	شرحہا	،،	،،	۴۶	شرح السماء والعالم	،،	اسکاٹ
۲۹	الشراب	،،	الپاغوبس	۴۷	شرح النفس	،،	،،
۳۰	النفس اشبیلی	،،	اشبیلی	۴۸	القوی الطبیعیہ	،،	،،
۳۱	مابعد الطبیعیہ	،،	کوندیانفی	۴۹	الرجم	،،	،،
۳۲	الطبیعیات	،،	،،	۵۰	المجسطی	ثابت بن قرہ	،،
۳۳	اسماء العالم	ابن سینا	،،	۵۱	الاوزان	،،	،،
۳۴	مختصر الحیوان	،،	اسکاٹ	۵۲	ترکیب الدوائر	،،	،،
۳۵	التعریفات	،،	نامعلوم	۵۳	التصور	،،	اشبیلی
۳۶	الکیمیا	،،	،،	۵۴	السیارات	،،	نامعلوم
۳۷	الحجر الفلسفی	،،	،،	۵۵	الثوابت	،،	،،
۳۸	الحدود	،،	،،	۵۶	التقارب والتباعد	،،	،،
۳۹	المنطق	،،	،،	۵۷	الدائرۃ المشمسہ	،،	،،
۴۰	الفلسفۃ الاولیٰ	،،	،،	۵۸	التناسب	،،	،،

شمار	کتاب	مصنف	مترجم	شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۵۹	احکام النجوم	ماشاء اللہ	اشبیلی	۷۶	التیسیر ابن زہر	ابن زہر	نیافینوس
۶۰	احکام القرانات و الممازجات	″	″	۷۷	البسائط	سرائیوں	سمعان الجنوی
				۷۸	صناعة جالینوس	ابن رضوان	کریمونی
۶۱	الاسطرلاب	″	نامعلوم	۷۹	الکتب الاربعہ		یامرلفوس
۶۲	الدائرہ	″	کریمونی	۸۰	الطبیعة وما ورا رہا	امام غزالی	کوندیسالفی
۶۳	البول	اسحاق الاسرائیلی	قسطنطین	۸۱	الزیج	الخوارزمی	ادلارالباطی
۶۴	الحمیات	″	″	۸۲	المدخل	″	″
۶۵	العناصر	″	کریمونی	۸۳	الجبر	″	کریمونی
۶۶	الاغذیہ	″	″	۸۴	الہندسہ	اولاد شاکر	″
۶۷	الحدود	″	″	۸۵	ینبوع الحیاة	ابن جبرئیل	کوندیسالفی
۶۸	الجراحة	زہرادی	″	۸۶	حرکات النجوم	البتانی	الطیبوری
۶۹	الرق	″	سمعان الجنوی	۸۷	مائة مسالہ	″	نامعلوم
۷۰	النظر والعمل	″	نامعلوم	۸۸	الزیج	″	ادبرت الترنس بنی
۷۱	التصریف	″	″	۸۹	القانون	″	یامرلفو
۷۲	الملکی	علی بن عباس	قسطنطین	۹۰	الجبر	ابو کامل شجا	کریمونی
۷۳	تقویم الابدان	ابن جزلہ	فراغوت	۹۱	الاسطرلاب	ابن صفا	نامعلوم
۷۴	الصحة	ابن بطلان	″	۹۲	المثلثات الکردیہ	جابر بن افلح	″
۷۵	تذکرة الکحالین	عیسیٰ بن علی	نامعلوم	۹۳	النصرانیہ و الاسلام	الیتروجی	اسکاٹ

شمار	کتاب	مصنف	مترجم	شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۹۴	زاد المسافر	ابن الجزار	قسطنطین	۱۰۳	التساویذ	قسطا بن لوقا	فیلنوف
۹۵	المدخل فی النجوم	القبیصی	اشبیلی	۱۰۴	اللاہوت	جابر	کریمونی
۹۶	الشفق	ابن ہیثم	کریمونی	۱۰۵	الانوار	ابن العوام	″
۹۷	المختصر	سرابیون	″	۱۰۶	الزیج	للزرقانی	″
۹۸	الحمیات	ماسویہ	نامعلوم	۱۰۷	السموم	المیمونی	المسینی
۹۹	الجراحة	″	فراغوت	۱۰۸	النجوم	الفرغانی	کریمونی و اشبیلی
۱۰۰	الایساغوجی	حنین	نامعلوم	۱۰۹	زہرالنجوم	البلخی	اشبیلی
۱۰۱	المنطق	السرخسی	″	۱۱۰	الاختیار	″	نامعلوم
۱۰۲	النفس والروح	قسطا بن لوقا	اشبیلی	۱۱۱	الرمد	″	″

یہ ان کتابوں کی فہرست ہے، جن کو خود مسلمانوں نے تصنیف کیا تھا، لیکن وہ کتابیں جن کا مسلمانوں نے یونانی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، مثلاً المجسطی، کتاب الحواس وغیرہ، اس سے الگ ہیں، شاید یہ کہا جائے کہ یہ کتابیں اگرچہ مسلمانوں کی تصنیف ہیں لیکن یہ مسلمانوں کی کتابیں نہیں ہیں، مسلمانوں کے اصلی علوم وفنون، حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، بلاغت، فصاحت وغیرہ ہیں، اور ان تمام کتابوں میں ایک کتاب بھی اس موضوع پر نہیں ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، مسلمانوں نے صرف یونانی زبان کی کتابوں کے ترجمے ہی نہیں کیے، بلکہ ان پر اضافہ کیا، ان کی حک و اصلاح کی، جدید مسائل پیدا کیے، مختصر یہ کہ ان علوم کو گویا خاص اپنا فن بنا لیا، اس بنا پر ان تراجم کے ذریعہ سے یورپ میں جو عقلی علوم کا ذخیرہ پہنچا وہ گویا خاص مسلمانوں کی تحقیقات کا لب لباب تھا، اس کے علاوہ مسلمانوں نے جن کتابوں کے لفظی ترجمے کیے تھے ان میں بعض کتابوں کی اصل ضائع ہو گئی، حکمائے یونان میں تموفارس ارسطوس، منیلادس، ثاددن کی

کتابوں کے ترجمے عربی میں ہوئے، اور ان کی اصل کتابیں ضائع ہوگئیں، کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ ابن مقفع نے فارسی سے عربی میں کیا، اور اصل نسخہ غائب ہوگیا، کتاب الفلاحۃ النبطیہ کا ترجمہ ابن وحشیہ نے سریانی سے کیا، اور اصل کتاب برباد ہوگئی، اس بنا پر یورپ کو ان حکما کے اصول اور ان کتابوں کی اطلاع صرف مسلمانوں ہی کے تراجم سے ہوئی، بہر حال یورپ مسلمانوں کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا، لیکن اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے صرف اسی پر فخر کافی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جس طرح زمانۂ قدیم میں ہم سے یورپ نے سیکھا تھا، اسی طرح ہم اس زمانہ میں یورپ سے سیکھیں، قدیم زمانہ میں فلسفہ کا دائرہ محدود تھا، اب یورپ نے ہر چیز کو فلسفہ بنا دیا ہے، اس لیے فلسفہ کے ان تمام اقسام کو اپنی زبان میں لانا چاہیے، ہندوستان میں جدید تعلیم روز بروز ترقی کر رہی ہے، لیکن ابھی تک تراجم کے سلسلہ میں بہت کم وسعت ہوئی ہے، اردو میں صرف چند کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے، مصر میں بلاشبہ تراجم نے ترقی کی ہے، اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن زبان کی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں، بالخصوص محمد علی پاشا کے زمانہ میں اس صیغہ نے خاص وسعت حاصل کی، اگر یہی حالت قائم رہتی تو یورپ کا تمام سرمایہ عربی زبان میں منتقل ہوگیا ہوتا، محمد علی پاشا کے زمانہ میں جدید علوم وفنون کی جو کتابیں ترجمہ وتالیف کے ذریعہ عربی میں آئیں، ان کی ایک فہرست ہم درج کرتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے، کہ ہماری علمی کوششوں کو یورپ کی علمی کوششوں سے کیا نسبت ہے؟

شمار	کتاب	مولف	سنہ اشاعت
۱ -	الآیات البینات فی علم النباتات	محمود فوزجی	سنہ ۱۸۸۸ء
۲ -	الظواہر البدیعہ فی علم الطبیعیہ	؍؍	سنہ ۱۳۰۹ھ
۳ -	منافع الحیوانات	؍؍	سنہ ۱۳۰۶ھ
۴ -	علم طبقات الارض	احمد ندے	سنہ ۱۲۸۸ھ

شمار	کتاب	مولف	سنہ اشاعت
۵ -	بنیۃ الکرۃ الارضیہ	احمد ندے	سنہ ۱۲۵۷ھ
۶ -	حسن الصناعہ فی علم الزراعہ	؍؍	سنہ ۱۲۹۱ھ
۷ -	علم النبات	؍؍	سنہ ۱۲۹۳ھ
۸ -	علم الحیوانات	؍؍	سنہ ۱۲۹۴ھ
۹ -	الکیمیاء الزراعیہ	ابو السعود	سنہ ۱۲۹۰ھ
۱۰ -	الجواہر البدلیۃ فی علم الطبیعیہ	محمد کامل الکفروی	سنہ ۱۳۰۵ھ
۱۱ -	الکیمیاء العمومیہ لہ اجزاء	ابراہیم لطفی	سنہ ۱۳۰۳ھ
۱۲ -	مبادی الطبیعیہ	؍؍	سنہ ۱۳۰۵ھ
۱۳ -	علم الحیوانات اللافقریۃ	؍؍	سنہ ۱۳۰۳ھ
۱۴ -	الباتولوجیا	محمد شافعی	سنہ ۱۲۵۹ھ
۱۵ -	الحصون القحیہ	؍؍	سنہ ۱۲۰۵ھ
۱۶ -	التذکرۃ الطبیہ	ابراہیم مصطفےٰ	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۷ -	التصریح الخاص	محمود صدیقی ومحمد امین	سنہ ۱۳۰۴ھ
۱۸ -	المادۃ الطبیعیہ جز آن	علی ریاض	سنہ ۱۲۹۷ھ
۱۹ -	جراحۃ الاقسام	محمد الدری	سنہ ۱۳۰۴ھ
۲۰ -	امراض النسا	احمد الرشیدی	سنہ ۱۲۶۰ھ
۲۱ -	امراض الجلدیہ جز آن	؍؍	سنہ ۱۲۶۲ھ
۲۲ -	فی علم الادویۃ والعلاج ۴ جلد	؍؍	سنہ ۱۲۸۳ھ

شمار	کتاب	مولف	اشاعت
۲۳ -	امراض الاطفال	احمد الرشیدی	۱۲۶۱ھ
۲۴ -	قواعد التحضیر	محمد الشیاسی	۱۲۶۲ھ
۲۵ -	الاقرباذین	حسن الرشیدی	۱۲۶۵ھ
۲۶ -	الطب السیاسی	ابراہیم حسن	۱۲۹۳ھ
۲۷ -	العملیات الجراحیۃ الکبری	محمد علی البقلی	۱۲۵۹ھ
۲۸ -	فن الجراحۃ (۲ جلد)	"	۱۲۸۲ھ
۲۹ -	اعمال الجراح (۲ جلد)	محمد علی البقلی	۱۲۶۲ھ
۳۰ -	الامراض الجلدیہ	حسن محمود	۱۲۹۲ھ
۳۱ -	السیاستہ الصحیحہ	محمد صفوت	۱۳۰۳ھ
۳۲ -	علم التشریح	حسن عبدالرحمٰن	۱۲۸۳ھ
۳۳ -	فن الولادۃ	عیسیٰ حمدی	۱۲۹۷ھ
۳۴ -	مختصر الطب الباطنی والعلاج	"	۱۳۰۲ھ
۳۵ -	صحۃ الحوامل والاطفال	"	۱۲۹۹ھ
۳۶ -	امراض الاطفال	"	۱۳۰۰ھ
۳۷ -	التسمیع والقرع	"	۱۳۰۴ھ
۳۸ -	مختصر فن العلاج	"	۱۳۰۱ھ
۳۹ -	مختصر الطب الباطنی (۲ جلد)	"	۱۲۹۸ھ
۴۰ -	الطب الباطنی والعلاج (۴ جلد)	سالم سالم	۱۲۲۸ھ
۴۱ -	المیاہ المعدنیہ	سالم سالم	۱۳۰۰ھ

"...میں جدید علوم و فنون کی اشاعت میں مصر کے علمی رسالوں نے خاص طور پر حصہ لیا ہے"

حیاتِ امام مالکؒ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں، بلکہ اس کو ان کے مضامین کا ایک مجموعہ سمجھنا چاہیے، جب وہ ابھی تیئس ۲۳ برس کے تھے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان الندوہ میں ۱۹۰۷ء میں "حیات امام مالکؒ" کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک مضمون لکھا تھا، اس میں اضافہ کرکے اس کو ایک مستقل تصنیف بنانے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اپنی اور مشغولیتوں کی وجہ سے یہ نہ کر سکے، ان کے قلم کا مسافر جہاں رکا تھا، وہیں رکا رہ گیا، اس کی افادیت کا خیال کرکے دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں اس کو اگست ۱۹۱۷ء میں کتاب ہی کی صورت میں شایع کر دیا گیا، جس کے اب تک متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس وقت اس کے لکھنے کا اولین مقصد تو ان کے سامنے یہ تھا کہ اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اسی ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح ہو، اس کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے حالات تو اردو میں منتقل ہو چکے تھے، لیکن امام مالکؒ کے متعلق ایک حرف بھی اردو میں موجود نہیں تھا، حالانکہ وہ فقیہ مدینۃ الرسول، امام دارالہجرۃ اور بانی اول فن حدیث تھے، اسی کے ساتھ مسلک حنفی کے علاوہ فقہ کے بقیہ تین مذاہب کے سلسلے انہی کی شاخیں ہیں، سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھ کو

علم حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی ہے، اسی کا اثر تھا جس نے مجھے اس فرض کے انجام دینے پر آمادہ کیا (دیباچہ حیات امام مالک)

اس کے لکھنے میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

(۱) الاصابہ فی تمیز الصحابہ (۲) تزیین الممالک، سیوطی (۳) تاریخ ابن خلکان (۴) اسعاف المبطا برجال الموطا، سیوطی (۵) تذکرۃ الحفاظ ذہبی (۶) کتاب الانساب سمعانی (۷) طبقات ابن سعد (۸) جامع بیان العلم ابن عبدالبر (۹) کتاب العلل ترمذی (۱۰) دبستان المحدثین شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱) توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس ابن حجر (۱۲) مناقب مالک ابن سعود الزواوی (۱۳) تقریب التہذیب (۱۴) خطیب بغدادی (۱۵) مسند امام ابوحنیفہ (۱۶) دارقطنی کتاب الذبائح بدرالدین زرکشی (۱۷) مقدمہ ابن صلاح (۱۸) مقدمہ اعلام الموقعین ابن حزم اندلسی (۱۹) الاخبار الطوال ابوحنیفہ دینوری (۲۰) کتاب الام (۲۱) کتاب العبر ابن خلدون ج ۳، (۲۲) کتاب الفہرست ابن ندیم (۲۳) مرأت الاوراق ابن حجر (۲۴) طبقات سبکی (۲۵) مرآۃ الجنان یافعی، (۲۶) کشف الظنون (۲۷) تہذیب الکمال۔

کتاب کی ضخامت کل ۱۰۶ صفحے ہے، مگر اس کے لکھنے میں ۲۷ کتابوں کو ماخذ بنایا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے تلاش، جستجو، محنت اور ریاضت کرنے کی عادت تھی۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ سید صاحبؒ نے یہ کتاب ۲۳ سال کی عمر میں لکھی، لیکن اس کا جو انداز بیان ہے اس سے یہ طالب علمانہ کوشش نہیں معلوم ہوتی، اور اگر یہ نہ بتایا جائے کہ مصنف نے کس سن میں یہ لکھی تو اس کی تحریر کی متانت اور اسلوب کے وقار سے بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ کسی سن رسیدہ اور تجربہ کار مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔

سوانح نگاری کے فن کے لحاظ سے پہلے امام مالکؒ کا نام اور نسب نامہ لکھا گیا ہے، پھر ان کے خاندان کا ذکر

ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پردادا ابوعامر عہد نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے، یہ خاندان یمن سے آکر مدینۃ النبی میں آباد ہوا، حضرت امام مالکؒ کے دادا مالک بن ابی عامر ایک جلیل القدر تابعی تھے، حضرت عثمانؓ سے قریبی تعلق رکھتے تھے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابۂ کبار سے شرف تلمذ حاصل تھا، مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے، انس، ربیع اور ابوسہیل نافع، امام مالکؒ کے والد ماجد انس تھے، جو وراثت علمی سے محروم تو نہ تھے، لیکن اپنے بھائی ابوسہیل نافع کی طرح ایک بلند پایہ محدث نہ تھے۔

امام مالک ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، وہ امام ابوحنیفہ سے تیرہ ۱۳ سال چھوٹے تھے، یہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کا زمانہ تھا، امام صاحبؒ نے جب ہوش سنبھالا تو مدینۃ النبی کو قرآن اور سنت کا بہت بڑا خزینہ دار پایا، سید صاحبؒ نے اس وقت کے فقہاء صحابہؓ، تلامذہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے نام لکھے ہیں جن کی وجہ سے مدینہ علم کا باغ و بہار بنا تھا، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"امام صاحبؒ نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا، اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا، اس لیے امام دار الہجرۃ ان کا لقب ہوا" (ص ۸)

امام مالکؒ نے جن شیوخ سے حدیث سیکھی ان کے اسمائے گرامی بھی سید صاحبؒ نے تلاش کر کے درج کر دیے ہیں، جو یہ ہیں:

نافع، محمد بن شہاب الزہری، جعفر صادق بن محمد بن منکدر، محمد بن یحیٰی، یحیٰی الانصاری، ابوحازم اور یحیٰی بن سعید، ان کے حالات اور کارناموں کا بھی مختصر طریقے سے احاطہ کیا گیا ہے، جن سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان کے علاوہ انھوں نے مکہ، بصرہ، خراسان اور جزیرہ کے شیوخ سے بھی احادیث کی روایت کی، جن کی تعداد سید صاحبؒ نے چورانوے ۹۴ بتائی ہے، اور ان کے نام بہ ترتیب یکجا لکھ دیے ہیں، اور جو شیوخ غیر مدنی تھے ان کی بھی تصریح کر دی ہے، اس سے سید صاحبؒ کی علمی تلاش و تجسس کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام مالکؒ نے فقہ کی تعلیم ربیعۃ الرائے سے حاصل کی، جو مسجد نبویؐ میں درس دیتے تھے، امام حسن بصریؒ،

شعبہ، اوزاعی، لیث مصریؒ اور یحییٰ انصاریؒ جیسے علمائے افاضل بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ (ص ۳۲)

سید صاحبؒ نے اس حصہ کو بہت مفید بنا دیا ہے، جس میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ کن کن اساتذہ سے کن کن اسباب کی بنا پر درس حاصل کیا، اس کو یہاں پر دُہرا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ ان ہی کے حلقۂ درس میں بیٹھے جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے، کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھے، مدینہ میں بیسیوں اشخاص ایسے تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے، لیکن انھوں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا، کیونکہ ان کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ ان میں بعض نادانستہ جھوٹ بولتے، بعض نحو سے ناواقف تھے، اور بعض پورے جاہل تھے، مدینہ میں ایسے مقدس لوگ بھی تھے جو بارش کی دعا مانگتے تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا، ان کو بہت سے احادیث اور مسائل کی سماعت بھی حاصل تھی، لیکن امام صاحبؒ نے ان سے استفادہ نہیں کیا، کیونکہ ان کے خیال میں وہ متقی و زاہد ضرور تھے لیکن اتقاء اور پرہیزگاری کے ساتھ علم اور فہم کی پختگی ان میں نہ تھی، اگر یہ نہ ہو تو اس راہ میں وہ مفید نہیں، اور نہ وہ حجت ہیں، ان سے بھی کچھ نہ سیکھنے کی کوشش کی جو ایماندار تو تھے لیکن اس فن کے آدمی نہ تھے، ان سے بھی حدیث کی سماعت نہیں کی جو نیک و صالح تھے لیکن جو کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے، انھوں نے اہل عراق سے بھی روایت نہیں کی، اس لیے کہ ان کے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی، اور ان کے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی، جب وہ کسی غیر مدنی شیخ سے اخذ حدیث کرنا چاہتے تو پہلے ان کا تجربہ اور نقد کر لیتے، انھوں نے اپنے بوڑھے دادا سے بھی کوئی روایت نہیں کی، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ عمر کے ضعف کا اثر حافظہ و عقل پر بھی پڑتا ہے۔

امام صاحبؒ کی مجلس درس کی جو تصویر سید صاحبؒ نے کھینچی ہے، اس کا مطالعہ اس حیثیت سے کیا جائے کہ اس زمانہ میں ایسی درسگاہ کی کیا نوعیت تھی اور اس کے کیا آداب ہوتے تھے، اس کے کچھ اقتباسات یہاں پر ہم سید صاحب ہی کی تحریر میں اس لیے دینا چاہتے ہیں کہ یہ بھی معلوم ہو کہ تیئیس[23] سال کے ایک اہل قلم کا انداز تحریر

اپنی اس کمسنی میں کیا تھا، پہلے مجلس درس کی تہذیب کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں:

"امام صاحبؒ کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحبؒ املائے حدیث کے موقع پر رونق افروز ہوتے تھے، جا بجا شرکائے مجلس کے لیے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو مجمر میں عود اور لوبان جلایا جاتا، صفائی و نزاہت کا یہ عالم ہوتا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ہوتا، جب حدیث نبویؐ کے املا کا وقت آتا پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کرتے۔" (ص ۳۲)

جب امام صاحبؒ درس دیتے تو اس موقع کا نقشہ سید صاحبؒ نے اس طرح کھینچا ہے:

"تمام لوگ سرنگوں خاموش، مودب بیٹھے تھے، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ بھی جب امامؒ کی مجلس درس میں اگر شریک ہوتے تو وہ بھی اسی طرح مودب ہو کر بیٹھتے، اس وقت امام صاحبؒ کی ادائے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، تمام مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو، جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا اژدحام، امراء کا ورود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مودب نشست، دمخانہ پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کر دیتا تھا۔" (ص ۴۲)

مدینہ کے والی اور خود خلیفۂ وقت ہارون رشید اپنی شان و شوکت کے باوجود ان کی مجلس درس میں کس قدر اپنے کو ہیچ سمجھتے، اس کی کہانی بھی سید صاحبؒ کے قلم کی زبانی سنیے:

"امام صاحبؒ حکومت نہ تھے لیکن صاحب حکومت اس آستانہ پر جھکتے تھے، امام شافعیؒ نے اپنی تعلیم کے لیے والیٔ مدینہ کو بغرض سفارش جب در امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا: "میرا کہاں وہاں گذر" ہارون رشید

جب مدینہ آیا تو امام صاحبؒ سے موطا کی سماعت کی خواہش ظاہر کی، امام صاحبؒ نے فرمایا: کل کا دن اس کے لیے ہے، ہارون رشید منتظر رہا کہ امام صاحبؒ خود دربار میں آئیں گے، کل کا دن آیا تو امام صاحبؒ اپنی مجلس درس میں تشریف فرما رہے، ہارون رشید نے پوچھا تو فرمایا کہ علم کے پاس لوگ آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا، اور آخر ہارون رشید کو باایں ہمہ جاہ و جلال خود امام کی مجلس میں حاضر ہونا پڑا، مجلس میں عام و خاص کی تمیز نہ تھی، ہارون نے جب درس کی شرکت کا ارادہ کیا تو کہا کہ عام لوگوں کو باہر کر دیجیے، امام صاحبؒ نے فرمایا: شخصی منفعت کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا، اللہ اکبر! کیا پاک روحیں تھیں" (ص ۳۲)

اس مجلس درس کی شہرت بڑھی، ذرا اس کا حال بھی سید صاحبؒ کے قلم سے سن لیجیے جو اس وقت تو نہیں، لیکن آگے چل کر عنبریں رقم ہونے والا تھا، مگر اس کے آثار اسی زمانہ سے ظاہر ہونے لگے تھے:

"ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ علم دین کا مرکز تھا، دوسرے یہ کہ امام ہمام کا خاندان ابتدا سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا، ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پر و بال نکالے کہ دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہوگئی، اور امام کی درسگاہ اختلاف مرز و بوم کی تلون زار بن گئی، ایک طرف سیستان اور دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ، دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسولؐ کی سرحد میں آکر مل گئے۔" (ص ۳۶)

اس کے بعد سید صاحبؒ امام صاحبؒ کے مسترشدین، مستفیدین اور تلامذہ کی فہرست دیتے ہیں جن میں خلفائے اسلام، امرائے بلاد، تابعین، شیوخ، ائمۂ محدثین، ائمۂ مجتہدین، قضاۃ، زہاد، صوفیائے کرام، ادبا، شعراء، مورخین، مفسر اور فلسفی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔

سید صاحبؒ نے امام مالکؒ کا جائزہ ایک فقیہ کی حیثیت سے بھی لیا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں فقیہ اور محدث کی تعریف اپنی اس کمسنی کے زمانہ میں جس موثر اور طاقتور انداز میں کی تھی اس پر بڑے سے

بڑے علماء، فقہاء اور محدثین اب بھی غور کر کے استفادہ کر سکتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ایک مفتی اور فقیہ کا فرض ایک محدث سے زیادہ ہے، محدث صرف ایک سرمایہ دار ہے، فقیہ اس سرمایہ کو لے کر عالم کار و بار میں آتا ہے، کھرے کھوٹے کی تمیز، احکام کی تصریح، عموم کی تخصیص، خصوص کی تعمیم، مطلق کی تقیید، مقید کا اطلاق، ناسخ و منسوخ کی تفریق، اوامر و سنن کی ترتیب، احکام غیر منصوصہ کا قیاس، احکام کے علل و مصالح کی تلاش، ضروریات انسانی کے مطابق احکام شرعیہ کا اعلان، رعایا و حکومت کے لیے قوانین کی تدوین، یہ ایک فقیہ و مفتی کے عام فرائض ہیں، جو ایک محدث محض کے رتبہ سے بلند تر ہیں۔" (ص ۴۳)

سید صاحبؒ نے اس سلسلہ میں عہد رسالت سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک فقہ کی تدوین کی جو کوشش ہوئی اس کی مختصر لیکن جامع تاریخ بھی لکھ دی ہے، جس سے مفید معلومات حاصل کیے جا سکتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "امام مالکؒ کے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے، ان کے پاس مدینہ، حجاز، بلکہ اطراف ملک کے سائلین کا ازدحام ہوتا تھا، موسم حج میں تمام علماء سمٹ سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے، تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ امام مالکؒ اور ابن ابی ذئب کے سوا کوئی اور فتویٰ نہ دے۔" (ص ۴۴)

امام صاحبؒ فتاویٰ دینے میں جن اصول کے پابند تھے، سید صاحبؒ نے ان کی بھی تصریح کر دی ہے، اور وہ یہ تھے:

ان سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزئیہ کی اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرما دیتے کہ لا ادری (میں نہیں جانتا)۔

دور کے شہروں کے مستفتی کو جواب دینے سے احتراز کرتے، اس کی وجہ یہ تھی کہ قرب و جوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتے تھے، لیکن ممالک بعیدہ میں تغلیط کی اطلاع مشکل تھی۔

مسائل و فتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے، اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہو جاتی،

اور کوئی اصلاح کر دیتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔

مگر جس بات کو صحیح سمجھتے، اس کو اعلان کرنے اور اس پر جمے رہنے میں ہر قسم کی مصیبت اور آزمائش کو گوارا کر لیتے۔ مثلاً اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اور اس نے ڈر کر بجبر واکراہ طلاق دے دی تو امام صاحبؒ کے نزدیک طلاق واقع نہ ہوگی، گو امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی، اس زمانہ میں مدینہ کا والی جعفر بن سلیمان تھا، جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی بھی تھا، اس نے امامؒ کو حکم دیا کہ وہ ایسا فتویٰ نہ دیں، لیکن امام صاحبؒ نے علی الاعلان اس رائے کا اظہار کیا، جعفر نے غضب ناک ہو کر ان کو ستّر کوڑے مارنے کا حکم دیا، تمام پیٹھ خون آلود ہو گئی، پھر اونٹ پر بٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کرائی، مگر اس حالت میں بھی وہ کہتے جاتے کہ جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو مجھ کو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک ابن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں، خلیفہ منصور کو اس کی خبر ہوئی تو جعفر والی مدینہ کی یہ حرکت اس کو پسند نہ آئی، اور اس کو معزول کر کے گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا، اور امامؒ کو معذرت کا خط لکھا، لیکن امام صاحب کو جعفر سے کوئی کد نہیں ہوئی اور فرمایا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اس کو معاف کرتا ہوں؟

اس سلسلہ میں سید صاحبؒ نے مختلف عباسی خلفاء سے امام صاحبؒ کے جو تعلقات رہے، اس کا ذکر کر کے اپنی کتاب کے اس حصہ کو دلچسپ بنا دیا ہے، جس سے امام صاحب کا رتبہ بھی بلند ہو گیا ہے۔

خلیفہ منصور کے خلاف محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحبؒ اس کے حق میں تھے، مگر وہ میدان جنگ میں لڑ کر مارے گئے، تو منصور نے لوگوں سے جبراً بیعت لی، امام صاحبؒ نے اس پر اعلان کیا کہ جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں (ص ۷۰) منصور نے ان کو اپنے یہاں طلب کیا اور اپنی خلافت کے متعلق رائے پوچھی تو امام صاحبؒ نے فرمایا: میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر یہاں آیا ہوں، یہ سن کر منصور نے کہا: سبحان اللہ! ابو عبداللہ! میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گرا دوں گا (ص ۶۲)

محمد المہدی کا زمانہ آیا تو وہ جب مدینہ منورہ آیا تو امام صاحبؒ سے مل کر ان کو سینے سے لگایا، اور پچیس تین ہزار دینار امام صاحبؒ کو بھیج کر ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کے ساتھ بغداد چلیں، مگر انھوں نے قاصد سے کہلا بھیجا کہ تھیلیاں سربستہ ہی پڑی ہیں، جی چاہے لے جائیے، لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا، پھر مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہ خلافت میں آئیں، سواری واپس کر دی کہ وہ مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتے کہ ان ہی گلیوں میں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پیدل پھرتے تھے: (ص ۶۳) مہدی نے اپنے دونوں شہزادوں موسیٰ اور ہارون کو امام صاحبؒ کے درس میں شریک ہونے کے لیے ان کے پاس بھیجا۔

ہارون رشید تو ان کا ایسا گرویدہ ہو گیا تھا کہ اس کی خواہش ہوئی کہ موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جائے اور مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی کرنے پر مجبور کیا جائے، لیکن امام صاحبؒ نے یہ کہہ کر روکا کہ ایسا نہ کیا جائے، کیونکہ خود صحابہؓ فروع میں اختلاف رکھتے ہیں، اور وہ ممالک میں پھیل چکے ہیں، اور ان میں ہر شخص راہ صواب پر ہے۔ (ص ۶۸)

سید صاحبؒ نے امام صاحب کے اخلاق و عادات کے جتنے واقعات ایک ساتھ درج کر دیے ہیں وہ اس قدر ایمان افروز ہیں اور یہ اس لائق ہیں کہ نصاب کی کتابوں میں درج کر کے ان کو درس میں پڑھایا جائے تاکہ ایک مسلمان کی سیرت کی تشکیل میں یہ معاون ہوں، سید صاحبؒ ہی کے الفاظ میں ان میں سے کچھ واقعات بہت ہی اختصار سے یہاں پر دُہرا دیے جائیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ان کے دو کام تھے: المصحف والتلاوۃ، وہ جمعہ کی شب عبادت و اطاعت میں مشغول رہتے، مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے، مسجد نبویؐ میں شور و غل پسند نہ فرماتے، کلام نبویؐ اس وقت تک زبان پر نہیں لاتے جب تک وضو یا غسل فرما کر با ادب نہ بیٹھ جاتے، اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے، مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں ان پر سوار ہو کر نہ نکلے، فرماتے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبویؐ سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں، ذات نبویؐ کی محبت اور حدیث نبویؐ کے شغل و انہماک کے

سبب سے کوئی شب ایسی نہیں گذری جس میں عالم رویا میں زیارت نبویؐ کا شرف حاصل نہ ہوتا، ان کی فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک بار امام شافعیؒ کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعیؒ نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی تو تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا، امام شافعیؒ کو وہ ہر سال گیارہ ہزار دینار مرحمت کرتے تھے، ایک بار کا واقعہ ہے کہ موزہ میں بچھو تھا، بے خبری میں پہن لیا، مجلس درس میں آکر بیٹھ گئے، بچھو نے متواتر سترہ بار ڈنک مارا لیکن آداب مجلس کے خیال سے پہلو تک نہ بدلا۔

وہ برابر خلفاء کے دربار میں آتے جاتے رہے، بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو فرمایا: اگر نہ جاؤں تو نطق حق کا موقع کہاں ملے، اعلان حق کی خاطر منصور اور ہارون رشید کو ڈانٹ دینے میں تامل نہ کرتے منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا خلیفہ کے ہاتھوں کا بوسہ دیتا، امام صاحبؒ نے کبھی یہ ذلت گوارا نہیں کی، مزاج میں صفائی اور نزاہت حد درجہ تھی، ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے، عود کی انگیٹھیاں برابر جلتی رہتی تھیں، ان کے اخلاق و عادات کی اور تفصیلات لکھ کر سید صاحبؒ آخر میں لکھتے ہیں:

"امام کو جو خصوصیات حاصل تھیں، ان میں یہ کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ مزید شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کا مکان تھا، اور مجلس نشست گاہ وہ تھی، جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا، یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اس بنا پر امام مالک نہ صرف علم و معارف فاروقی کے وارث تھے، بلکہ ان کی جائداد ظاہری کا بھی خدا نے انھیں وارث بنایا۔" (ص ۸۰)

سید صاحبؒ نے اپنی تحریر کا یہ ٹکڑا جس کیفیت قلبی کے ساتھ لکھا ہے، امید کہ ہمارے ناظرین بھی اسی کیفیت قلبی کے ساتھ اس کو پڑھیں گے۔

آخر میں سید صاحبؒ نے امام صاحبؒ کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، اور بتایا ہے کہ ان سے

حسب ذیل کتابیں منسوب ہیں:

(۱) مؤطا (۲) رسالہ مالک الی الرشید (۳) احکام القرآن (۴) المدونۃ الکبریٰ (۵) رسالہ مالک الی ابن مطرف (۶) رسالہ مالک الی ابن وہب (۷) کتاب الاقضیہ (۸) کتاب المناسک، (۹) تفسیر غریب القرآن (۱۰) کتاب المجالسات عن مالک (۱۱) تفسیر القرآن (۱۲) کتاب المسائل،

سید صاحبؒ نے ان کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کے امام صاحبؒ کی تصانیف ہونے نہ ہونے کے متعلق بھی توجہ دلائی ہے، لیکن اس حصہ میں بہت ہی پر مغز بحث موطا پر ہے، اور اپنی طالب علمی اور کمسنی میں اس کی اہمیت کو جس طرح اپنی کاوش فکر سے سمجھایا ہے، اس سے بہت سے لوگ آج بھی استفادہ کر سکتے ہیں، ہم اپنے ناظرین کی خاطر اس کو مختصر طریقہ سے پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس سے اپنی بحث کی ابتدا سید صاحبؒ نے اس طرح کی ہے:

امامؒ کی اصلی تصنیف موطا ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانۂ اسلام کی دوسری کتاب ہے، اول کلام خدا، اور ثانی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۸۴)

پھر بلاد اسلامیہ میں جن مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی اس کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مرکز نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبویؐ کا سب سے بڑا گنجینہ تھا جس سعادت اندوز کی قسمت میں تھی وہ امام مالک ہی ہیں۔ (ص ۸۶)

سید صاحبؒ اس کی تالیف کا صحیح زمانہ تو متعین نہیں کر سکے، لیکن یہ لکھ گئے ہیں کہ ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی اور فرمائش کی تھی کہ اس مجموعۂ احکام میں نہ ابن عمرؓ کی سختیاں ہوں، نہ ابن عباسؓ کی رخصتیں ہوں، اور نہ ابن مسعودؓ کے شواذ۔ (ص ۸۷)

سید صاحبؒ اس کے معترف ہیں کہ یہ حسن نیت کے ساتھ لکھی گئی، اس لیے یہ مقبول ہوئی، لکھتے ہیں کہ:

"امام صاحبؒ موطا کی تالیف میں مشغول ہوئے، اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہونچی تو مدینہ کے

اور علماء بھی اپنے احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے، لوگوں نے امام سے جاکر عرض کیا، تو آپ نے فرمایا صرف حسن نیت کو بقا ہے، یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح اتری" (ص ۸۷)

جب یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچی تو یہ بہت مقبول ہوئی، اس کی مقبولیت کو ظاہر کرنے میں سید صاحبؒ نے سعدون نامی ایک شاعر کی نظم نقل کر دی ہے، جس کے آخر میں وہ لکھتا ہے کہ موطا آفتاب ہے، اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارے ہیں۔ (ص ۸۸)

موطا کی وجہ تسمیہ بہت سی بتائی جاتی ہے، لیکن سید صاحب کا خیال ہے کہ موطا سے مراد وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد تمام صحابہ گذرے، یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہؓ کا عمل رہا، اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔ (ص ۸۹)

موطا کی نوعیت کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابتداءً اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں لیکن امام کے خامۂ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار قلم زد کر دیں، باقی ۱۷۲۰ میں جن میں مسند اور مرفوع ۶۰۰ ہیں، مرسل ۲۲۸، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال و فتاویٰ ۲۸۵، بلاغات مالک ۵،
(ص: ۸۹)

اس کی نوعیت کی تصریح یہ لکھ کر بھی کرتے ہیں کہ موطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں، اس لیے وہ دیگر ابواب و فصول جو بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں، موطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں، اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو کتاب السنن کہنا چاہیے، (ص ۸۹)

سید صاحبؒ موطا کی یہ خصوصیت بھی بتاتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں مسند ابی حنیفہ، مسند شافعی اور مسند ابن حنبل ضرور ہیں، لیکن یہ ان ائمہ کی خود لکھی ہوئی نہیں ہیں، ان کے بعد مرتب ہوئیں، موطا کو خود امام مالکؒ نے لکھا۔

سید صاحبؒ نے موطا کی امتیازی حیثیت یہ بھی بتائی ہے کہ (۱) موطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی

گئیں ان کا بیشتر زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ تھے، موطا میں احادیث صحاح و مسند یا منقطع و مرسل کو بنائے اول اور آثار و فتاویٰ کو بنائے ثانی قرار دیا گیا ہے (۲) موطا میں صرف اسی حدیث یا نوشتے نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل ہے، (۳) موطا مدینہ میں تالیف ہوئی، اس کے رواۃ حجازی ہیں، دیگر مسانید اور موطائیں کوفہ، بصرہ، شام اور یمن وغیرہ میں تالیف ہوئیں، اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت میں سب پر فائق ہیں۔ (ص ۹۱)

سید صاحبؒ نے طبقات کتب حدیث میں موطا کا درجہ متعین کرتے ہوئے ابن اثیر جزری (المتوفی ۶۰۶ھ) کے حوالہ سے اس کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے، ان کے نزدیک موطا، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی صحاح ستہ ہیں، لیکن کچھ ایسے محققین بھی ہیں جو موطا کو صحاح ستہ میں داخل نہیں کرتے، موطا کا درجہ متعین کرنے میں سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عام علماء تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بعد جگہ دیتے ہیں، لیکن محققین قدماً اور عموماً متاخرین اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں، ان ہی میں شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ بھی ہیں، سید صاحبؒ ان ہی کے ہم خیال ہو کر لکھتے ہیں کہ خود میں بھی بدو طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں، (ص ۹۲) یہ رائے ان کی کمسنی کے زمانہ کی تھی، مگر بعد میں بھی اس میں ترمیم نہیں کی۔

اس کمسنی کے زمانے میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ موطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لیے قادح ہیں، لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع موطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے، مگر حقیقت کی رو سے یہ تمام مراسیل و موقوفات و منقطعات، متصل، مرفوع اور مسند ہیں، اس بنا پر درحقیقت موطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں، اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر الا ماشاء اللہ بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے، اس سے موطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، سید صاحبؒ نے اپنی کمسنی میں یہ سب کچھ جو لکھا ہے، وہ بڑے سے بڑے علماء کے لیے آج بھی قابل غور ہے۔

سید صاحبؒ موطا کی امتیازی خصوصیات کو اس طرح بتاتے ہیں (۱) مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی صحیح ترین مجموعہ تھا (۲) اس کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں، وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں، (۳) بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، موطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاریؒ کو اپنی بیس[۲۰] ثلاثیات پر ناز ہے، اور موطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے، اس کے علاوہ اس کے چالیس[۴۰] ثنائیات ہیں۔

آخر میں سید صاحبؒ نے شروح موطا، تجرید و اسناد موطا کے عنوانات سے بہت سے مفید معلومات فراہم کیے ہیں، اسے پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ وہ اپنی مختصر تحریروں میں بھی زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے میں فطری ذوق رکھتے تھے۔

اس کتاب میں سید صاحبؒ نے امام مالکؒ سے جس غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا ہے اس بنا پر شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مالکی تھے، یا اپنی کمسنی میں مالکی ہی رہے ہوں گے، لیکن یہ صحیح نہیں، جن لوگوں کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، یا جو ان کی نجی زندگی سے اچھی طرح واقف رہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک وہ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے پیرو رہے، یہ ان کی رواداری اور فراخ دلی تھی کہ دوسرے مسلک کے ائمہ میں جو خوبیاں تھیں، ان کا اعتراف برابر کرتے رہے، ڈاکٹر حمید اللہ نے پیرس میں ایک تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ:

اس کتاب کو لکھے ہوئے تقریباً ۷۰ برس ہو گئے، لیکن یہ اب بھی مفید معلومات کا ماخذ بنی ہوئی ہے، اگر کوئی اس سے بہتر کتاب لکھنے کی کوشش کرے گا تو وہ اسی کے ایجاز کا اطناب ہوگا۔

تذکرۃ المحدثین جلد اوّل

اس میں صاحب تصنیف محدثین کے علاوہ امام مالکؒ صاحبِ موطا کا بھی تذکرہ ہے جو "حیات امام مالکؒ" کی پوری تلخیص ہے، مولفہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، قیمت ۲۳ روپیے۔

"منیجر"

رُوداد اقبالؒ

از

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کشمیر

"پروفیسر جگن ناتھ آزاد علامہ اقبالؒ کی ایک مبسوط سوانح حیات مرتب کر رہے ہیں، یہ مضمون اس کا حرف اول ہے جو ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے" ——— معارف

علامہ اقبالؒ کے سوانح حیات کے سلسلہ میں خود ان کے خیالات کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے نیاز مندوں مثلاً سید نذیر نیازی یا محمد شفیع (م۔ش) نے جب کبھی علامہ سے ان کے حالاتِ زندگی کا ذکر کیا یا ان سے ان کی زندگی کے واقعات کی کوئی تفصیل پوچھی تو انھوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ میں کب پیدا ہوا، اور کہاں پیدا ہوا، یا کون سا امتحان کس سنہ میں پاس کیا، یہ سب فروعی اور غیر ضروری باتیں ہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے، اصل میں اہمیت میرے افکار اور خیالات کی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ میں نے جس طرح اپنے خیالات کو پیش کیا، اسے دریافت کیا جائے، اور میری اس ذہنی کشمکش کا سراغ لگایا جائے جو میرے خیالات کے ارتقاء کا باعث بنی۔

چنانچہ میں نے اس کتاب میں کوشش یہ کی ہے کہ اقبالؒ کے واقعات زندگی کے ساتھ ہی ساتھ عہد بہ عہد ان کے افکار کا ارتقاء بھی ان کے سوانح حیات کا جزو بنتا چلا جاؤں، اس ضمن میں ان کے ارتقائے افکار کے ہر پہلو پر میں نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی افکار کے ساتھ ہی میں نے ادب اور خود ان کی شاعری کے متعلق بھی ان کے افکار کو نظر انداز نہیں کیا، کیونکہ اپنی

شاعری کے متعلق ان کی خود تنقیدی کے رویہ کا مطالعہ ان کی شخصیت کی تشکیل اور ارتقاء کے ادوار کو سمجھنے میں خاصی مدد دے سکتا ہے۔

اب جہاں تک علامہ کا تعلق ہے آج دنیا بھر میں ان کے فکر و فن پر کام ہو رہا ہے، فکر پر زیادہ، فن پر کم، اور فکر پر کام کی صورت یہ ہے کہ ع مٹتی نہیں زیادہ سے فریاد کسی کی۔

خیر علمی اور ادبی کاموں میں اختلاف رائے کی تو بڑی گنجائش ہے، لیکن اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایک طبقہ اقبال کو قوم پرست کہے اور دوسرا طبقہ فرقہ پرست کہے، یا پاکستان میں ان کے ایک ہی کام یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ پر بات ختم کر دی جائے، اور فکر اقبال کے باقی پہلوؤں کو کم اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔

یہ ہمارے ادب کی بدقسمتی ہے کہ اقبال اپنے بعض قدر دانوں کے ہاتھوں کچھ اس انداز سے پیش ہوئے ہیں کہ عامۃ الناس میں اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد جہاں پاکستان نے اقبال کو اپنا ملی ہیرو قرار دیا وہاں ہندوستان نے اقبال سے ایک طرح کی بے اعتنائی برتی، یہ بے اعتنائی ان ہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی، جو بعض پرستارانِ اقبال نے اقبال کے بارے میں پیدا کی ہیں، اور ابھی تک جن کا سلسلہ جاری ہے۔

اسلام کی محبت اقبال کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی، یہ کیفیت اقبال کے کلام میں اول سے آخر تک نمایاں ہے، لیکن یہ اقبال اور کلام اقبال سے بے اعتنائی برتنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، نہ ہی اس بنا پر ہم اقبال کے نظریات کو رد کرنے کا حکم صادر فرما سکتے ہیں، ملٹن اور دانتے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے، اور تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے، عشق مذہب، عشق بنی نوع انسان تک پہونچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے، ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر آئے تو اسے کم نظری کے سوا اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

یہاں اپنا نقطۂ نگاہ پوری وضاحت سے بیان کرنے کے لیے میں اپنے ایک سفر پاکستان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، ۱۹۸۰ء کی بات ہے، پشاور یونیورسٹی پشاور نے مجھے ایک لیکچر کی دعوت دی، جب میں پشاور جانے کے لیے لاہور پہونچ چکا تھا تو یونیورسٹی کی طرف سے مجھے لیکچر کا عنوان موصول ہوا، اور وہ عنوان یہ تھا "کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں؟" مجھے یہ عنوان دیکھ کر یک گونہ مسرت ہوئی، کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر ہندوستان اور پاکستان میں بعض دوستوں کے ساتھ بات چیت تو اکثر ہوئی تھی، لیکن اس پر باقاعدہ لکھنے کی یا لیکچر دینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

یہ سوال کہ "کیا علامہ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں؟" مطالعۂ اقبالیات میں ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے، ہندوستان میں تو یہ سوال (اگرچہ سوال کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک مسئلہ کی صورت میں) اکثر میرے سامنے آیا، بالخصوص ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک، جب کہ علامہ اقبال کی صد سالہ تقاریب ہندوستان کے گوشے گوشے میں منائی جا رہی تھیں، اس سے قبل جس زمانہ میں کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے لیے میں اقبال نمائش مرتب کر رہا تھا اور علامہ مرحوم کے اساتذہ کی تصاویر کی تلاش کے سلسلہ میں میرے خطوط ہندوستان کے اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپ رہے تھے، اس وقت مجھے زیادہ تو نہیں، لیکن دو ایک عتاب نامے موصول ہوئے تھے، جن کے مطالعہ سے میرا ذہن اسی سوال کی جانب منتقل ہوا تھا، یہی سوال مجھ سے ۱۹۷۹ء میں رنگون (برما) کی ایک محفل میں بھی کیا گیا تھا، جہاں میں نے ایک خالص ادبی موضوع پر تقریر کی تھی، وہ موضوع تھا "مسجد قرطبہ کے شعری محاسن"

در اصل اس سوال کے اندر دو اور سوال مضمر ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ بات چیت کی ابتدا ان ہی مضمرات سے کی جائے، اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار کیا ہے، اور دوسرا یہ کہ اقبال کے مخاطب کون ہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار قرآن اور حدیث ہیں، لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ اس کے علاوہ مشرق و مغرب

کے تمام فکری دھاروں سے اقبالؔ بے نیاز رہے ہیں؟ اقبال کے فکر و فن کے بغور مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے، صرف یہی نہیں کہ اقبالؔ نے مختلف نظام ہائے فکر کا بغور مطالعہ کیا، بلکہ ان کے اپنے نظام فکر میں ان نظام ہائے فکر کے اکثر پہلوؤں کے رد و قبول کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، چنانچہ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اسلامی فکر کے ساتھ ہی ساتھ ہندو فلسفہ، مغربی فلسفہ اور مارکس اور اینگلز کا جدلیاتی مادی نظام فکر بھی شامل ہے۔ اگر ہم کلام اقبال سے یہ تمام فکری عناصر خارج کر دیتے ہیں تو ان کی نظم و نثر کا اکثر حصہ مفہوم سے عاری ہو کے رہ جاتا ہے، اور فکر اقبال کی محض ایک ادھوری تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، مطالعہ کلام اقبال میں ہندو فلسفے، مغربی فلسفے اور مارکس اور اینگلز کے جدلیاتی مادی نظامِ فکر میں سب سے زیادہ اہمیت میں مغربی فلسفے کو دوں گا، اگرچہ فلسفۂ مغرب کے تعلق سے کلام اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اکثر افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، اہل قلم کی ایک جماعت نے یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا ہے کہ علامہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تغلیط کی ہے، اور دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کا پرتو ہیں، یہ حضرات اس ضمن میں نیتشے اور برگسان کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں، یہ دونوں نظریے انتہا پسندانہ ہیں، اور حقیقت سے دور ہیں، حقیقت ان کے بین بین ہے، اور اس پردے کو اقبالؔ نے خود اپنی نثر و نظم میں اکثر پردہ اٹھایا ہے۔

علوم مغرب کے تعلق سے فکر اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیرؔ مرحوم نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے، Aspect of Iqbal کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

"انھوں (اقبال) نے یورپی کلچر کے اندرون تک پہنچنے کی کوشش کی، اور اسلام کو جدید مغربی فکر کی روشنی میں سمجھا، اور اس کی تاویل پیش کی، اقبال کوئی متعصب فرقہ پرست نہیں تھے، جیسا کہ ان کے اکثر نام نہاد مداح بھی انھیں پیش کرتے رہتے ہیں، انھوں نے اعتراف کے ساتھ یورپی فضل و کمال کے سرچشموں سے علم حاصل کیا۔"[1]

---

[1] Aspect of Iqbal از ڈاکٹر محمد دین تاثیر (دیباچہ) ص ۲، ناشر قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور ۱۹۳۸ء۔

دراصل جو کچھ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے کہا ہے، وہ خود علامہ کے اپنے افکار ہی کا پرتو ہے، اقبال اپنی تصنیف "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں لکھتے ہیں:

"تاریخ جدید کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام روحانی اعتبار سے بڑی تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف گامزن ہے، مغرب کی طرف اس جادہ پیمائی میں کوئی خرابی نہیں ہے، اندیشہ صرف یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم مغرب کی ظاہری چمک دمک ہی سے مسحور ہو جائیں، اور مغربی تہذیب کی حقیقی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہ جائیں۔"[1]

جس زمانہ میں اقبال اپنی مذکورہ کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے مختلف ابواب لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، تو انھوں نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ان دنوں ایک کتاب لکھنے کا خیال کر رہا ہوں جس کا نام ہوگا Islam As I Under Stand It اس ضمن میں انھوں نے مذکورہ خط میں لکھا:

"میری زندگی کا بیشتر حصہ مغربی فلسفے کے مطالعہ میں صرف ہوا ہے، اور یہ نقطۂ نگاہ میری فطرت ثانیہ بن گیا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر میں اسلام کے حقائق اور صداقتوں کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں۔"

یہ تو خیر ایک پرائیویٹ نوعیت کا خط ہے (۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کا۔ اگرچہ میں علامہ مرحوم کے ان افکار کو جو ان کے خطوط میں مندرج ہیں کم اہمیت نہیں دیتا) لیکن یہی بات انھوں نے The Reconstruction of Religious Thought in Islam —

---

[1] The Reconstruction of Religiou Thought in Islam ناشر Shaikh Muhammad Ashraf Kashmiri Bazar Lahor Reprinted 1965 —

ین مسلمانوں کے سامنے ایک لائحۂ عمل کے طور پر پیش کی، جب انھوں نے لکھا:

"ہمارے سامنے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں، اور اُن ہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اپنی اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش روؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے[1]"

یہ جو انھوں نے لکھا کہ ہم علوم جدید کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور ان ہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اپنی اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش روؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے تو یہ بات انھوں نے محض گفتار کی حد تک ہی محدود نہیں رکھی، بلکہ اپنی نظم و نثر میں اسے ایک عملی صورت بھی دی اپنی نظم و نثر میں اگرچہ انھوں نے قدم قدم پر اپنے نظریات مغربی مفکرین کے نظریات کی تردید میں پیش کیے، اور مغربی فلسفے کو فرنگی شیشہ گری کے نام سے یاد کرتے ہوئے جا بجا مغرب کی نارسائی کی جانب اشارے کیے ہیں، مثلاً

مے از مے خانۂ مغرب چشیدم به جانِ من که دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی ازاں بے سوز تر روزے ندیدم[2]

یا

کہا اقبال نے شیخ حرم سے تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون

---

[1] The ReConstruction of Religious Thought in Islam - Shaikh Muhammad Ashraf - Kashmiri Bazar. Lahore 1965 - P.P. 97-

[2] (ترجمہ) میں نے مغرب کے میخانے سے شراب چکھی، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے دردِ سر مول لیا، میں فرنگستان کے مفکرین اور مدبرین کے ساتھ بیٹھا، (اور حقیقت یہ ہے) کہ اس سے زیادہ بے سود دن میں نے اور کوئی نہیں دیکھا

ندا مسجد کی دیواروں سے آئی فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

یا

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

یا

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

مگر مغربی علم و فن کے جن چشموں سے انھوں نے پیاس بجھائی ہے، ان کا ذکر انھوں نے بڑی کشادہ دلی اور احسان مندانہ انداز سے کیا ہے، اور اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ مغربی علوم کا ذکر ایک طالب علمانہ خلوص سے کرتے ہیں، مثلاً

ع خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ[1]

یا ع علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

یا ع کیمیا سازی او ریگ رواں را زر کرد

لیکن اس کی روشن ترین مثال دینے کے لیے میں ایک بار پھر The Reconstruction of Religious Thought in Islam کی طرف رجوع کروں گا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"لہٰذا ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام در پیش ہے، ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں"[2] (ترجمہ از سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

---

[1] مغربی فلسفیوں کے دیے ہوئے درس میری عقل میں اضافہ کا باعث ہوئے۔ [2] بزم اقبال، نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ، لاہور، ۱۹۵۸ء (ص ۱۴۵) The Reconstruction of Religious Thought in Islam _ Shaikh Muhammad Ashraf Lahore 1965 - P97

اور مذکورہ کتاب اول سے آخر تک اسی کوشش اور کاوش پر مبنی ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کا بنیادی سرچشمہ افکار قرآن اور حدیث ہے، یعنی اسلام ہے تو ہمیں اس بات سے خالی الذہن نہیں ہونا چاہیے کہ اقبال اسلام سے مراد لیتے ہیں، اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیل نو، یا دوسرے لفظوں میں "Islam as I Under Stand it"

اس ضمن میں نقادانِ اقبال کے دو انتہا پسندانہ نظریوں کا ذکر تو میں نے کیا ہے، ایک تیسرا انتہا پسندانہ نظریہ اور بھی ہے، اور وہ ہمیں مس ماریا سٹی پٹینس کے یہاں نظر آتا ہے، لیکن اس کا ذکر کرنے سے قبل میں ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہوں گا، ۱۹۷۰ء کے وسط میں میری ملاقات ماسکو (یو۔ ایس۔ ایس۔ آر) میں پریگارینا نتاشا سے ہوئی، پریگارینا نتاشا کو کلام اقبال سے عشق ہے، اور اس وقت تک وہ کلام اقبال کے متعلق دو کتابیں لکھ چکی ہیں، ایک اقبال کے فکر پر، دوسری اقبال کی شعریات پر، پریگارینا نے دوران گفتگو میں "بانگ درا" کھول کے اقبال کی نظم "میں اور تو" نکالی، اور مجھ سے پوچھا کہ کیا "تو" سے مراد "ہندو" ہے، میں نے نظم کے ایک ایک شعر کی تشریح کی اور بتایا کہ "تو" سے مراد ہندو نہیں ہے، بلکہ اس "تو" سے مراد ایک مخاطب نہیں، کئی مخاطب ہیں، بنیادی طور پر اقبال نے اس نظم میں اپنا فلسفۂ حرکت اور فلسفۂ ارتقاء بیان کیا ہے، یہ آپ کہہ سکتی ہیں کہ "تو" سے مراد Have ہے، اور "میں" سے مراد Have - not ہے، لیکن Have not بھی ہمیشہ Have-not نہیں رہے گا، کیونکہ "تغیر" اصول فطرت ہے، ایک ہی مقام پر قرار یا قیام، اصول ارتقاء کے خلاف ہے، اقبال حرفِ کُن سے بھی یہی مراد لیتے ہیں، کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون، یعنی کائنات ہر لمحہ ارتقاء پذیر ہے، پریگارینا نے میری بات غور سے سننے کے بعد کہا کہ اسی عنوان کی ایک نظم اور بھی ہے، کیا وہاں "تو" سے مراد ہندو ہے؟ میں نے اس نظم کے دو تین اشعار سنائے ؎

ع نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

کہنے لگیں ہاں یہی نظم ہے، میں نے کہا اس میں بھی "تو" سے مراد ہندو نہیں ہے، بلکہ اس نظم میں بحیثیت مجموعی

خطاب مسلمانوں سے ہے، ان مسلمانوں سے جنھوں نے غیر اسلامی طریقے اپنا لیے ہیں، میں نے اس نظم کے اکثر اشعار کی تشریح کی، بالخصوص اس شعر کی ؎

گلۂ وفائے جفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
جو صنم کدے میں بیاں کروں تو صنم پکارے ہری ہری

اس پر نتاشا کہنے لگیں کہ ہاں اب بات سمجھ میں آگئی ہے، پہلے ان دونوں نظموں کے متعلق میرا خیال کچھ اور تھا.

معلوم نہیں اقبال کے بعض غیر ملکی طلبہ کے دل میں یہ بات کیوں گھر کر گئی ہے کہ اقبال کی شاعری ہندو، اور مسلمان کے دائروں میں محصور ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں جن میں اقبال کو ایک بہت ہی محدود انداز میں پیش کیا گیا ہے، جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے اقبال اس وقت دوراہے پر ہیں، اس حقیقت کو کہ اقبال کا سرچشمۂ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہیں، اس طرح سے پیش کرنا کہ اقبال ہندو اور مسلمان کے تنگ دائروں سے باہر نہ نکل سکیں، کلام اقبال اور فکر اقبال کے انتہائی بے احتیاط اور غیر ذمہ دارانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے، اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا، ڈاکٹر تاثیر نے جب ۱۹۳۸ء میں یہ لکھا تھا کہ :

"وہ مذہبی جنون رکھنے والے زہد پرست نہ تھے، جیسا کہ ان کے نام نہاد مداح کہتے ہیں۔"

تو وہ در اصل اسی خطرے کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس کی ایک جھلک مجھے پریگارینا کے ساتھ بات چیت میں نظر آئی،

اوپر جس تیسرے انتہا پسندانہ نظریہ کا ذکر آیا تھا، یہ نظریہ ہمیں مس ہمیٹی پٹینٹس کے یہاں نظر آتا ہے، وہ اپنی کتاب Philasophy and Sociology میں لکھتی ہیں:

"وہ مغربی فلسفے اور سائنس سے خوب واقف تھے، اور جانتے تھے کہ مذہبی جدت پسندی کے خیالات کو نظری یا علمی مطابقت کے ساتھ کیسے پیش کیا جا سکتا ہے، ان کی یہ خواہش تھی کہ تعلیمات اسلام کو مغربی فلسفے سے قریب تر لایا جائے، جدید سائنس اور علم کے نتائج نئی نسل کے اس ہی متوسط

طبقے اور دانشوروں کی مزاجی کیفیت میں گونج پیدا کر رہے تھے جو پرانے غیر استدلالی اعتقاد و ادعاء کا بوجھ اپنی گردن سے اتار پھینکنا چاہتے تھے، اور نئے خیالات کو اپنانے کے آرزومند تھے۔"

خدا جانے مس میسی ٹینٹس اقبال اور اسلام دونوں کے متعلق کیا سوچ رہی تھیں جب انھوں نے اقبال کے بارے میں مندرجۂ بالا جملے لکھے، مس میسی ٹینٹس کی یہ بات کہ اقبال تعلیم اسلام کو مغربی فلسفے کے قریب تر لانا چاہتے تھے، میری سمجھ سے باہر ہے، کیونکہ اقبال نے خود اپنے لیکچروں کے دیباچے میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے :

"چنانچہ یہی مطالبہ ہے جسے ان خطبات میں جو مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر مرتب ہوئے اور مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیے گئے، میں نے اسلام کی روایات فکر، علیٰ ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں، الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے، یوں بھی یہ وقت اس طرح کے کسی کام کے لیے بڑا مساعد ہے" (ترجمہ از سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ - بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء صفحہ ح The Reconstruction of Religious Thought in Islam P.P.1)

اس طویل اقتباس سے میرے نزدیک یہ معنی بالکل نہیں نکلتے کہ اقبال تعلیمات اقبال کو مغربی فلسفے کے قریب لانا چاہتے تھے، اقبال کی متذکرۂ بالا تحریر کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال الٰہیات اسلامیہ میں عقلی اساسات کی اہمیت بیان کر رہے ہیں، اگر علامہ نے ان ہی لیکچروں میں یہ کہا ہے کہ "ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور ان ہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش روؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔" تو اس کی تاویل اس طرح سے کرنا کہ اقبال تعلیمات اسلام کو مغربی علوم کے قریب تر لانا چاہتے تھے کئی طرح کی غلط اندیشیوں کے لیے رستہ بنانے کے مترادف ہے، کیونکہ مس میسی ٹینٹس کی تاویل کے پیش نظر تو مغربی علوم ہی معیار یا کسوٹی

بن جائیں گے، حالانکہ اقبال کے سارے سلسلۂ فکر میں کسوٹی یا معیار یا مطمح نظر خود اسلام ہے، نہ کہ مغربی علوم مغربی علوم والی بات سمجھنے میں مس میسی ٹینٹس سے سہو ہوا ہے، اور انھوں نے فکر اقبال کی تاویل پیش کرنے کے لیے بہت ہی غلط اور خطرناک جادہ پر قدم رکھا ہے، اقبال نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت 'Knowledge and Religion Experience' (علم اور مذہبی مشاہدات) میں یہ کہہ کر کی ہے :

"اب جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی عقلی اساسات کی جستجو کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہی سے ہو گیا تھا، آپ ہمیشہ دعاء فرماتے: "اے اللہ! مجھ کو اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ کر" (ترجمہ از سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۴،
The Reconstruction of Religious Thought in Islam Pp. 3

یعنی بقول اقبال ؎

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ   در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ[1]

اب اس سوال کا دوسرا حصہ ہمارے سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ اقبال کے مخاطب کون ہیں؟ اس معاملہ میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ کلام اقبال میں اکثر و بیشتر مواقع پر اقبال کے اولین مخاطب مسلمان ہیں، لیکن اسی تخاطب میں بسا اوقات اقبال نے مسلمانوں کے پردے میں سارے عالم انسانیت سے بات کی ہے، ارمغان حجاز[2] میں قارئین نے دیکھا ہوگا کہ "حضور ملت" اور "حضور عالم انسانی" کے عنوان سے جو دو ابواب قائم کیے گئے ہیں ان میں مضامین اور مباحث قریب قریب ایک ہی طرح کے ہیں، پہلے چند رباعیات "حضور ملت" کے عنوان سے پیش ہیں :

---

[1] اے خدا مجھے سینہ کے اندر ایک باخبر دل عطا کر، مجھے ایسی نظر دے کہ میں شراب کے اندر نشے کو دیکھ سکوں۔

پرد در وسعتِ گردون یگانہ ، نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ [۱]

جواں مردے کہ خود را فاش بیند جہانِ کہنہ را باز آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش کہ او با خویشتن خلوت گزیند [۲]

نخستیں لالۂ صبحِ بہارم پیاپے سوزم از داغے کہ دارم
بچشمِ کم مبیں تنہائیم را کہ من صد کاروانِ گل در کنارم [۳]

جواناں را بد آموز است ایں عصر شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بدامانش مثالِ شعلہ پیچم کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر [۴]

ز علم چارہ سازے بے گدازے بسے خوشتر نگاہِ پاک بازے
نکوتر از نگاہے پاک بازے دلے از ہر دو عالم بے نیازے [۵]

۱؎ وہ آسمان کی وسعت میں یگانہ انداز سے پرواز کرتا ہے، (لیکن) اس کی آنکھ ہمیشہ آشیانے میں اپنی شاخ پر رہتی ہے، چاند اور ستارے اس کی کمند میں گرفتار ہوتے ہیں، اور زمانہ کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۲؎ وہ جوانمرد جو اپنے آپ کو نمایاں طور پر دیکھتا ہے، یعنی اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے، پرانے جہان کو دوبارہ پیدا کرتا ہے، اور چونکہ وہ اپنی ذات کے ساتھ تنہائی اختیار کر لیتا ہے (یا خدا میں) اس لیے ہزار انجمنیں اس کا طواف کرتی ہیں، (یعنی ساری کائنات اس کے دروازے پر دستک دیتی ہے) ۳؎ میں بہار کی صبح کے لالہ کا پہلا پھول ہوں، اور اس داغ کی وجہ سے جو مجھ میں ہے میں سراپا سوز و گداز ہوں، تو میری تنہائی کو کم نگاہی سے نہ دیکھ کہ میں اپنے پہلو میں پھولوں کے سو کاروان لیے ہوئے ہوں، ۴؎ یہ دور (عصر حاضر) جوانوں کو بدی سکھانے والا دور ہے، یہ آج کا دور شبِ ابلیس کی صبح ہے، میں شعلے کی طرح اس کے دامن سے الجھ رہا ہوں (یعنی اس کے خلاف نبرد آزما ہوں) کیونکہ یہ دور بے نور بھی ہے اور بے سوز بھی ۵؎ اس علم کے مقابلہ میں جو دنیاوی آسائش کے لیے چارہ سازی تو کر سکتا ہے لیکن دلوں میں گداز نہیں پیدا کر سکتا ایک پاکباز نگاہ کہیں بہتر ہے اور دونوں جہانوں سے بے نیاز دل پاکباز نگاہ سے بھی بہتر ہے۔

اب "حضورِ عالمِ انسانی" کے زیرِ عنوان دی ہوئی چند رباعیات دیکھیے:

نگہ دید و خرد پیمانہ آورد کہ پیماید جہانِ چار سو را
بہ آشامے کہ دل گویند نامش بجویش اندر کشید ایں رنگ و بو را [۱]

دلے چوں صحبتِ گل می پذیرد ہماں دم لذتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں "من" آفریند چو "من" محکومِ تن گردد بمیرد [۲]

بہ رُوما گفت با من راہبِ پیر کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را ترا تقدیر و ما را کشتِ تدبیر [۳]

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت چہ بے نم چشمِ آں کز گل بزاید
چو جانِ او بگیرم شرمسارم دلے او را ز مردن عار ناید [۴]

۱؎ نظر نے (اس جہان کو) دیکھا، اور عقل ایک پیمانہ لے کر آگئی کہ جہانِ چار سو کی پیمائش کرے، لیکن اس بے آشام نے کہ جسے دل کہتے ہیں، اس تمام عالمِ رنگ و بو کو اپنے اندر سمو لیا ۲؎ دل جب جسم کی صحبت اختیار کر لیتا ہے، تو اسی وقت نیند کی لذت اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، (لیکن) وہ جب اپنے اندر "میں" کا جذبہ پیدا کر لیتا ہے، تو وہ بیدار ہو جاتا ہے، اور "میں" جب تن کا غلام ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کی نیند سو جاتا ہے ۳؎ روم میں مجھ سے راہبِ پیر (پوپ) نے کہا کہ میرے پاس ایک "نکتہ" ہے، جو تو مجھ سے حاصل کر لے، ہر قوم اپنی موت (کا سامان) خود ہی پیدا کر لیتی ہے، تجھے (یعنی اہلِ مشرق کو) تقدیر نے، اور ہمیں (یعنی اہلِ مغرب کو) تدبیر نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۴؎ میں نے سنا کہ موت نے خدا سے یہ کہا: وہ شخص جو مٹی سے پیدا ہوتا ہے (یعنی جو مادی آسائش اور آلایش میں گرفتار رہتا ہے)، اس کی آنکھ کتنی بے نم ہوتی ہے (یعنی اس کی شخصیت سوز و گداز سے کس قدر خالی ہوتی ہے)، جب میں اس کی روح قبض کرتی ہوں تو مجھے شرم محسوس ہوتی ہے، لیکن اس (بے غیرت انسان) کو مرنے سے شرم نہیں آتی۔

ویسے بھی مومن اور کافر کے بیان کا جہاں تک تعلق ہے، اقبال نے بنیادی اہمیت عمل کو دی ہے،

مثلاً:

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم   به ز دیں دارے کہ خفت اندر حرم[1]

اس نظریہ کی ایک بہت خوبصورت مثال "اسرار خودی" میں ملتی ہے، جب کہ شیخ برہمن سے کہتا ہے: ؎

تا شدی آوارۂ صحرا و دشت   فکرِ بے باکِ تو از گردوں گذشت

باز بیں و با زمیں گردوں نورد   در تلاشِ گوہرِ انجم مگرد

من نگویم از بتاں بیزار شو   کافری، شائستۂ زنّار شو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن   پشت پا بر مسلکِ آبا مزن

گر ز جمعیت حیاتِ ملت است   کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ   درخورِ طوفِ حریمِ دل نۂ

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور   تو ز آذر من ز ابراہیم دور

قیسِ ما سودائیِ محمل نہ شد   در جنونِ عاشقی کامل نہ شد

مُرد چوں شمعِ خودی اندر وجود   از خیالِ آسماں پیما چہ سود[2]

---

[1] مورتی کے سامنے (بیٹھا ہوا) بیدار دل کافر اس دیندار (مسلمان) سے بہتر ہے جو حرم میں آکے سوگیا ہو۔

[2] تو کہ صحرا و دشت میں آوارہ پھر رہا ہے تیرا فکر (فلسفیانہ خیال) آسمان سے بھی آگے نکل گیا ہے، اے آسمان کی سیر کرنے والے! تو زمین کے ساتھ رفاقت اختیار کر، اور ستاروں کے موتیوں کی تلاش میں آوارہ نہ پھر، میں یہ نہیں کہتا کہ تو مورتیوں سے بیزار ہو جا، تو کافر ہے اس لیے جنیو پہننے کے قابل ہو جا، اے پرانی تہذیب کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک کو ترک نہ کر، اگر ملت کی زندگی جمعیت کی بدولت ہے تو کفر بھی جمعیت ہی کا سرمایہ ہے، تو کہ کافری کے عمل میں بھی پختہ نہیں ہے، اس قابل نہیں ہے کہ حریم دل کا طواف کرسکے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

"جاوید نامہ" میں اس طرح کی متعدد روشن مثالیں ملتی ہیں، مثلاً "خطاب بہ جاوید" میں کہ اقبال کے اپنے الفاظ میں "خطاب بہ نژادِ نو" ہے، علامہ کہتے ہیں ؎

گر خدا سازد ترا صاحب نظر   روزگارے را کہ می آید نگر

عقل ہا بے باک و دل ہا بے گداز   چشم ہا بے شرم و غرق اندر مجاز

علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل   زوج زوج اندر طوافِ آب و گل

آسیا، آں مرز و بومِ آفتاب   غیر بین از خویشتن اندر حجاب[1]

اب دیکھیے بات سارے ایشیا کی ہو رہی ہے، اس میں بسنے والی کسی ایک قوم کی نہیں، اس میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، لامذہب لوگ بھی ہیں، اس سارے ایشیا کو اقبال پہلے تو مرز بومِ آفتاب کہتے ہیں، اس کے بعد بہ حیثیت مجموعی سارے ایشیا کو

"غیر بیں از خویشتن اندر حجاب"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۰) ہم (دونوں) جادۂ تسلیم و رضا سے بھٹک گئے ہیں، تو اپنے بزرگوں سے (جو مورتی پوجا کرتے تھے) دور اور میں حضرت ابراہیمؑ کی پیروی سے دور ہو گیا ہوں، ہمارے اندر جو مجنوں (یعنی جذبۂ عشق) موجود ہے وہ لیلیٰ کے محمل کا دیوانہ نہیں بن سکا ہے، اور یہ مجنوں جنونِ عاشقی میں کامل نہیں ہو سکا ہے، جب وجود کے اندر خودی کی شمع ہی بجھ گئی تو آسمان کی پیمائش کرنے والے فلسفے سے کیا حاصل ہے؟

[1] اگر خدا تجھے نظر کی دولت عطا کرے تو اس زمانے کو دیکھ جو آنے والا ہے، عقل بے باک اور دل بے گداز ہو کر رہ گئے ہیں، آنکھیں بے شرم ہو گئی ہیں، اور (حقیقت کے عوض) مجاز میں غرق ہیں، سائنس اور آرٹ، دین اور سیاست، عقل اور دل، یہ سب جوڑے جوڑے کی صورت میں آب و گل (کائنات کے مادی پہلو) کے طواف میں مصروف ہیں، ایشیا جو آفتاب کی جنم بھومی ہے اپنے آپ سے حجاب کر رہا ہے، اور دوسروں کو دیکھ رہا ہے (یعنی اپنی تہذیب و تمدن سے بیگانہ ہو رہا ہے اور مغرب کی کورانہ تقلید میں محو ہے) (اقبال کے یہاں یہ لفظ کتابت کی غلطی سے "مرز و بوم" چھپ گیا ہے، صحیح لفظ اضافت اور عطف کے بغیر ہے "مرزبوم"۔

قرار دیتے ہیں، اور پھر اس موضوع پر شمشیر برہنہ بن کر سامنے آتے ہیں اور فرماتے ہیں :

قلبِ او بے وارداتِ نو بہ نو حاصلش را کس نگیرد با دو جو

روزگارش اندریں دیرینہ دیر ساکن و یخ بستہ و بے ذوقِ سیر

صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک آہوئے اندیشۂ او لنگ و لوک

عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ بستۂ فتراکِ مردانِ فرنگ

تاختم بر عالمِ افکارِ او بر دریدم پردۂ اسرارِ او

در میانِ سینہ دل خون کردہ ام تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

اس کے بعد وہ خوبصورت اشعار آتے ہیں جن کا ذکر اقبال کے فکر و فن کے تعلق سے اکثر ہوتا رہتا ہے۔

من بطبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف

حرفِ پیچا پیچ و حرفِ نیش دار تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار

حرفِ تہ دارے بہ اندازِ فرنگ نالۂ مستانۂ از تارِ چنگ

اصلِ ایں از ذکر و اصلِ آں ز فکر اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر

آب جویم از دو بحرِ اصلِ من است فصلِ من فصل است و ہم وصلِ من است

۱ اس کا دل وارداتِ نو بہ نو کے بغیر ہے، اور اس کے حاصل کو کوئی دو جو کے بدلے میں بھی لینے کو تیار نہیں۔

۲ اس دیر کہن میں اس کے حالات ساکن، یخ بستہ اور بے حرکت ہو چکے ہیں، آج یہ نام نہاد ملاؤں کا صید اور بادشاہوں کا شکار ہے، اور اس کے فکر کا ہرن آج لولا اور لنگڑا ہو چکا ہے، اس کی عقل، دین و دانش، ناموس اور ننگ یہ سب مغربی آقاؤں کی وابستہ فتراک ہو چکی ہیں، میں نے اس کے عالم افکار پر حملہ کیا، اور اس کے رازوں کے پردوں کو چاک کر دیا۔

تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد طبعِ من ہنگامۂ دیگر نہاد

یہاں دو نکتے خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ اتنی اہم بات وہ سارے زمانہ سے کہہ رہے ہیں، صرف مسلمانوں سے نہیں کہہ رہے ہیں، دوسرے یہ کہ "با انداز فرنگ" سے مراد ہے مغربی فلسفے کے انداز پر، گویا دوسرے لفظوں میں فلسفۂ مغرب کو ایک خراج تحسین ادا کر رہے ہیں، اور پھر جاوید سے یا جاوید کے پس پردہ ساری نسل نو سے کہہ رہے ہیں کہ خدا تجھے میرے اس سارے فلسفے کا بھی وارث بنائے اور میرے جذبۂ عشق کا بھی۔

یہ حصہ سارے کا سارا، اول سے آخر تک نئی نسل کے نام پند و نصائح سے لبریز ہے، اور یوں تو اس کا ہر شعر حکمت اور وجدانی کیفیت سے مملو ہے، لیکن میں صرف چند اشعار پیش کروں گا

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

۱ میں نے اپنے زمانہ کے مزاج کے ساتھ دو طرح سے بات کی ہے، اور دو سمندروں کو میں نے دو کوزوں میں بند کر دیا ہے، ایک تو میں نے پیچا پیچ طریقے سے بات کی ہے، اور دوسرا نیش دار طریقے سے، تاکہ مردوں کے عقل و دل دونوں شکار کروں (لفظ پیچا پیچ سے اشارہ ہے اپنی فلسفیانہ کتاب — The Re Construction of Religius Thought in Islam کی طرف، اور "حرفِ نیش دار" سے مراد ہے شعری تصانیف) پیچا پیچ والی بات تو مغربی فلسفے کے انداز میں تہ دار زبان میں بیان کی ہے، اور حرف نیش دار ایک نالۂ مستانہ ہے جو رباب کے تاروں سے پھوٹا ہے، حرف نیش دار کا اصل "ذکر" ہے، اور حرف پیچ دار کی اصل "فکر"، خدا کرے تو میرے ذکر و فکر دونوں کا وارث بن جائے۔ میں ایک ندی ہوں اور میری اصل دو سمندروں سے ہے، میرا حاصل فراق بھی ہے اور وصال بھی چونکہ میرے زمانے کا مزاج مختلف واقع ہوا ہے، اس لیے میری طبیعت نے ایک نئے ہنگامے کی بنیاد ڈالی ہے۔

سرّ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال — خلوت و جلوت تماشائے جمال

آدمیت احترام آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی

آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن — بر طریقِ دوستی گامے بزن

کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل وائے دل[1]

"جاوید نامہ" کا ذکر آگیا ہے تو یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ اس آسمانی سفر کی ابتداء فلکِ قمر سے ہوتی ہے، جہاں اقبال شیوجی مہاراج سے ملتے ہیں، اور وہ "زندہ رود"[2] کو ہنگام طلوع خاور کا مژدہ دیتے ہیں، اسی جاوید نامہ میں وادیٔ طواسین، طاسین گوتم سے شروع ہوتی ہے اور طاسینِ زرتشت، طاسین مسیح سے ہوتی ہوئی طاسین محمد صلعم تک پہونچتی ہے۔ "زبورِ عجم" کے ایک حصہ میں تمام غزلوں کا مخاطب انسان ہے، اصولی طور پر مذہب اور قطعی طور پر اسلام یقیناً اقبال کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے، لیکن غالب کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ "غالب یقیناً ان شعراء میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انھیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے۔[3]

---

[1] ملا کے نزدیک منکر حق کافر ہے، لیکن جو اپنے آپ سے منکر ہے وہ میرے نزدیک کافر تر ہے، دین کا راز راست گفتاری، حلال کی کمائی اور خلوت و جلوت میں خدا کو دیکھنے میں ہے، آدمیت انسان کے احترام کا نام ہے، تو آدمی کے مقام سے باخبر ہو جا آدمی جب ہی آدمی ہیں جب کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ربط ضبط رکھتے ہیں، (اس لیے) تو دوستی کے رستے پر اپنا پاؤں رکھ' اپنے دل کی وسعتوں میں کفر و دین دونوں کو سنبھال لے، دل ہی اگر دل سے بھاگ جائے تو اس دل پر افسوس ہے،

[2] جاوید نامہ میں اقبال کا نام "زندہ رود" (Living Stream) ہے جو انھیں اس آسمانی سفر کے رہنما مولانا روم نے دیا ہے (من ز شوخی گویم او را زندہ رود) [3] شذرات فکر اقبال (مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال) مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۲۔

جہاں تک کلام اقبال کے مخاطب کا تعلق ہے بقول ڈاکٹر نکلسن اس کا شاعرانہ پیغام محض ہندی مسلمانوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس نے عالم اسلام کو مخاطب کیا ہے، لیکن میرے نزدیک ڈاکٹر نکلسن کی مذکورہ رائے پر مراکش کے پروفیسر ایس۔ آئی فہد کی رائے ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

"اقبال ایک ہمہ گیر شہری ہیں، ان کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیازِ نسل و ملک سما جاتے ہیں، آپ عظمت انسانی کے علمبردار ہیں، اس لیے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے"[1] اٹلی کے پروفیسر جی توچی (G. Tucci) لکھتے ہیں "...... لہٰذا ہم اس عظیم الشان شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہ سکتے، جس کو شاید ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، اور جن کا زور دار پیغام صرف مہذب ذہنوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ان سب کے لیے بھی ہے جو ابھی تک انسانیت کی تقدیر سے مایوس نہیں ہوئے"[2]

اقبال نے مادی موت سے بلند ہو کر زندگی جاوداں کا راز صرف ملت اسلامیہ کو نہیں بتایا بلکہ سارے عالم انسانیت کو بتایا ہے، اور انفرادی سطح پر انھوں نے یہ بات انسان ہی سے کہی ہے، ان کی آخری نظم 'قطعی طور پر آخری نظم' بھی انسان ہی کے متعلق ہے ؎

کسی کو کیا خبر، یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے — غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

(ارمغان حجاز)

۱۹۷۷ء میں جب ہم لوگ، دنیا کے مختلف حصوں سے پہلی اقبال عالمی کانگریس میں شرکت کے لیے لاہور اور سیالکوٹ گئے تھے، تو سری لنکا سے آئے ہوئے نمائندے تیسا وجے رتن نے اپنے مقالہ میں کہا تھا:

"...... یہی وہ پیغام تھا، جس کی انسان دوستی نے اس کی شاعرانہ کشش کو عالمگیر بنا دیا ہے"

---

[1] و [2] مترجمہ از ڈاکٹر سلیم اختر۔

وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہو، خواہ وہ مسلم پاکستان ہو یا ہند وبنگال، ایران ہو، یا روس کی کوئی اسلامی جمہوریہ، چین ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کے مسیحی طلبہ کا کوئی اجتماع یا بدھ طالب علموں کی کوئی ایسی محفل، ہر جگہ وہ نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے جنھیں اسلامی احیاء کے داعی محمد اقبال کے قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے[۱]۔"

اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ یہاں ہندوستان میں بعض دفعہ ایک عجیب وغریب صورت حال میری نظر سے گذری ہے، اور وہ یہ کہ اقبال پر لکھنے والے چند اہل قلم نے فکر اسلام سے اقبال کی وابستگی کو ایک معذرتی انداز میں پیش کیا ہے، یہ ایک افسوسناک صورت حال ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے ادبی دیانت پر بھی حرف آتا ہے، اس صورت حال پر میں اپنے ایک انگریزی مقالے[۲] "Iqbal Poet and Politician" میں جو میں نے چند برس قبل میسور یونیورسٹی میں اور اس کے بعد لاس اینجلس (امریکا) کے ایک ادبی اجتماع میں پڑھا تھا کسی حد تک بحث کر چکا ہوں، جس میں یہ کہنے کی میں نے کوشش کی ہے کہ ہماری یہ روش ہمیں کلام اقبال کے دیانت دارانہ مطالعہ سے دور لے جائیگی، اس کے برعکس ولیم او ڈگلس ایسوشی ایٹ جسٹس سپریم کورٹ یو۔ ایس۔ اے کی یہ رائے، جو حنیف ملک کی کتاب "Iqbal: Poet Philosopher of PAKISTAN" میں ان کے لکھے ہوئے پیش لفظ میں موجود ہے، زیادہ وقیع ہے، اور حقیقت پر مبنی ہے:

"ان دنوں زیادہ ضرورت مشرق و مغرب میں افہام وتفہیم کے پلوں کی ہے، افہام وتفہیم اور مفاہمت کے ان پلوں کی ضرورت دانشوری کی بلند ترین سطح پر ہے، تاکہ مختلف النوع تہذیبیں، جو

---

[۱] ترجمہ از ڈاکٹر سلیم اختر Iqbal: [۲] "Iqbal: Poet and Politician" شمول بہ کتاب Hind and Arab مصنفہ جگن ناتھ آزاد، ص ۹۷ تا ۱۲۲ (مطبوعہ نیشنل بک ہاؤس اردو بازار، لاہور، پاکستان، ۱۹۸۳ء)

اپنی اپنی جگہ پر عظیم تہذیبیں ہیں، ایک دوسرے کو جان سکیں اور سمجھ سکیں، اقبال مشرق سے ایک ایسی آواز تھی جس نے مغرب کے ساتھ ایک مشترکہ انداز کی ہم نسبی کا تصور پیدا کیا، اور جس نے ایک ایسی عالمگیر برادری کو تشکیل دینے میں اپنا حصہ ادا کیا، جو نسل، مذہب اور زبان کے اختلافات کو برداشت کرتی ہے۔

چنانچہ دلی انکسار کے ساتھ ہم اقبال کے نام کو اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور اس جذبۂ احسان مندی کے تحت خدا کے شکر گذار ہیں کہ ایک ایسا انسان ہم لوگوں میں بھی موجود تھا، اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اگرچہ اقبال فرزند پاکستان تھے لیکن ہم اہل امریکا بھی اسے اپنا ہی سمجھتے ہیں"۔

اب آخر میں یہاں اقبال کے کلام سے اس قسم کی مثالیں پیش کرنے کے عوض

ع اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو!

ع مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ،

ع شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں

ع چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

ع ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی

ع درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی

یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سورج اگرچہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مشرق سے اس کی مناسبت ازلی اور ابدی ہے، لیکن اس کے باوجود خورشید کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہیں ہے، وہ اپنے انوار سے مشرق، مغرب، شمال، جنوب، افلاک، زمین ہر ایک کو منور کرتا ہے، اور اس مثال کی روشنی میں اس سوال کا جواب کہ کیا اقبال مسلمانوں کے شاعر ہیں، میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر بھی ہیں، ہندوستان بلکہ ہندوستان کی بیداری کے شاعر بھی ہیں، ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں۔ (باقی)

ما قبل عہد مغلیہ میں طب کا فروغ

از جناب حکیم الطاف احمد اعظمی (علیگ)

مغل سلاطین کی آمد سے بہت پہلے ہندوستان میں آیوروید طریقہ علاج کے پہلو بہ پہلو یونانی طریقہ علاج بھی رائج ہو چکا تھا۔ سب سے پہلا طبیب جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا، اس کا نام حکیم ضیاء الدین عبدالرافع ہروی ہے، جو ہرات کا رہنے والا تھا، غزنہ میں خانوادہ آل سبکتگین کا آخری تاجدار خسرو ملک (پسر خسرو شاہ) جب ۱۱۶۰ء میں لاہور کو دارالسلطنت قرار دے کر حکمراں ہوا تو ضیاء الدین عبدالرافع ایک طبیب کی حیثیت سے اس کے دربار سے وابستہ ہو گیا، مولف مآثر الامراء کے بیان کے مطابق اس بادشاہ کے بعد جب تک زمام حکومت شہاب الدین الملقب بہ ابوالمظفر سلطان معز الدین غوری (متوفی ۶۰۲ھ/۱۲۰۵) کے ہاتھ میں رہی، اس وقت تک ضیاء الدین عبدالرافع ایک طبیب حاذق کی حیثیت سے نمایاں رہا۔[1] نور الدین محمد عوفی اس کے فضل و کمال کے متعلق لکھتا ہے۔

"عبدالرافع جہانِ فضل و کمال، صاحب ہنر مجد و بزرگی کا آسمان، اور نفس و لطف کے اعتبار سے نادرۂ روزگار تھا، طب میں کامل مہارت کے ساتھ فن لغت میں بھی اسے ید طولیٰ حاصل تھا، نفس عیسیٰ اور طبیعت دست موسیٰ کی مانند تھی، سلطان خسرو ملک کے دربار میں نہایت معزز و محترم تھا۔"[2]

بادشاہان غزنہ کے بعد طب کی ترقی و اشاعت کے اعتبار سے عہد خلجی اور عہد تغلق زیادہ اہمیت

۱ـ نیر واسطی، تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، راولپنڈی ۱۹۷۲ء ص ۱۲ ۲ـ نور الدین محمد عوفی، لباب الالباب، بریل لیڈن ۱۹۰۶ء ج ۲ ص ۱۲۰۔

رکھتا ہے۔ عہد علائی میں جس کثیر تعداد میں علماء و فضلا موجود تھے، اس کا ذکر کرتے ہوئے ضیاء الدین برنی لکھتا ہے۔

"دہلی میں وہ یگانۂ عصر علماء و فضلا موجود ہیں جن کی نظیر سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، رے، غرضیکہ ربع مسکون میں موجود نہیں ہے۔"[1]

اطباء کے ذکر میں مولف مذکور لکھتا ہے:۔

"عصر علائی کے اطباء علم طب میں مہارت کامل رکھتے تھے، اور علاج امراض میں بقراط و جالینوس بھی ان کے آگے ہیچ تھے، اور ایسے سرآمد روزگار اطباء نہ تو اس عہد میں موجود تھے، اور نہ کسی دوسرے عہد میں دیکھے گئے۔"[2]

علاء الدین خلجی (متوفی ۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ) کے عہد میں جو نامور اطباء موجود تھے، ان میں حکیم مولانا بدر الدین دمشقی، حکیم حسام الدین ماریکلی، حکیم مطرز، حکیم صدر الدین ماریکلی (پسر حکیم حسام الدین ماریکلی)، حکیم علم الدین، مُلّی طبیب، حکیم اعز الدین بدایونی، مہ چند طبیب، جاجا جراح، اور علم الدین کحال کے نام قابل ذکر ہیں، یہ اطباء اپنے علم و فن میں سارے ہندوستان میں بے نظیر تھے،[3] استاد الحکماء مولانا بدر الدین دمشقی کے متعلق برنی لکھتا ہے۔

"مولانا بدر الدین دمشقی، عہد علائی کے طبیب تھے، شہر کے تمام اطباء ان سے کتب طب کا درس لیتے تھے، باری تعالیٰ نے ان کو علم طب میں وہ لیاقت و مہارت عطا فرمائی تھی کہ محض مریض کی نبض دیکھ کر سبب مرض معلوم کر لیتے تھے، اور یہ بھی جان لیتے تھے کہ مریض شفا پا ہو سکے گا یا نہیں۔"[4]

۱ـ تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی)، انجمن ایشیائی بنگال کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۳۵۲ ۲ـ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۲ ۳ـ ایضاً ص ۳۶۳ ۴ـ ایضاً ص ۳۶۲

حکیم مولانا بدرالدین دمشقی کو امتحان بول میں اس درجہ مہارت حاصل تھی کہ وہ قارورہ دیکھ کر جان لیتے تھے، کہ اس میں انسان کا پیشاب ہے یا جانور کا اور اگر جانور کا ہے، تو کس جانور کا ہے، فرشتہ[1] لکھتا ہے:-

از اطبای مسیح نفس استاد الحکماء مولانا بدرالدین دمشقی آنچناں بود کہ اگر در شیشہ بول چند جانور انداختہ نزد او آوردندی او بدیہہ حکم کردی کہ بول فلاں و فلاں جانور دریں شیشہ کردہ اند[2]	استاد الحکماء مولانا بدرالدین دمشقی ان مسیحا نفس اطباء میں تھے، جن کے پاس اگر لوگ چند جانوروں کا ملا جلا پیشاب بھی لاتے تو وہ فوراً بتلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں جانوروں کا پیشاب اس شیشی میں ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر، مولانا دمشقی کے غیر معمولی علم و فضل کا اعتراف ان لفظوں میں کرتے ہیں،

"حذاقت تدبیر اور نبض و بول کی شناخت میں اپنے عہد کے بے نظیر طبیب تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار قارورہ میں مختلف جانوروں کا پیشاب مخلوط کر کے ان کے سامنے لایا گیا، دیکھتے ہی پہچان گئے، اور تبسم فرمایا، اور کہا کہ اس قارورہ میں چند جانوروں کا پیشاب مخلوط کر کے لایا گیا ہے، مولانا تقریر و افہام میں منفرد تھے، طب کے دقیق معانی کو بسہولت طلبہ کے ذہن نشین کرا دیتے تھے، بالخصوص شیخ کی کتاب "القانون" کی شرح و توضیح میں تو انھیں درجۂ کمال حاصل تھا۔"[3]

حکیم صدرالدین (پسر حسام الدین ماریکلی)، کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں۔

"علوم الٰہی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں مطب کرتے تھے، اور درس بھی دیتے تھے، نہایت نیک نفس، ذکی و فطین اور حاذق

۱، ۲ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، منشی نولکشور ۱۸۶۴ء ج ۱ ص ۱۳۲ ۳ مولانا عبدالحئی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء ج ۲ ص ۱۶۔

طبیب تھے، مریض کو دیکھتے ہی اسبابِ مرض جان لیتے تھے، اور بہت جلد مریض ان کے علاج سے صحت یاب ہو جاتے تھے۔"[1]

برنی لکھتا ہے۔

"پسر و پدر دونوں علم طب میں مہارت رکھتے تھے، حکیم صدرالدین نہایت نیک نفس تھے، اور مریض کو دیکھتے ہی اس کا مرض اور سبب مرض جان لیتے تھے۔"[2]

حکیم مطرز کے بارے میں ضیاء الدین برنی لکھتا ہے۔

"حکیم بدرالدین دمشقی کی طرح نبض و بول کی معرفت میں کوئی دوسرا طبیب شہر دہلی میں حکیم مطرز کا ہمسر نہ تھا۔ باری تعالیٰ نے انھیں حسن تقریر کی دولت سے نوازا تھا، قانون و موجز اور دیگر کتب طب کے مسائل و مطالب کو وہ اس طرح مشرح کر دیتے تھے کہ طلبہ ان کے حسن تقریر اور بدائع بیان پر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔"[3]

حکیم یمنی کے متعلق صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں۔

"نہایت حاذق طبیب تھے، سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں درس و افادہ کا کام انجام دیتے تھے۔"[4]

حکیم علم الدین شیرازی کے بارے میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں۔

"علوم حکمت اور فن طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی میں درس دیتے تھے۔"[5]

عہد علائی کی طرح عہد تغلق میں بھی طب یونانی نے نمایاں ترقی کی، بانی سلطنت سلطان غیاث الدین

۱ مولانا عبدالحئی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء ج ۲ ص ۶۲ ۲ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۶۳ ۳ ایضاً ص ۳۶۲ ۴ نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۰۰، ۵ ایضاً ص ۸۵۔

تغلق شاہ (متوفی ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) کو نہ صرف علم طب سے دلچسپی تھی، بلکہ اس میں اسے عملی مہارت بھی حاصل تھی، جب خسرو خان کے مقابلے میں اسے فتح حاصل ہوئی، تو اس نے دشمن کے مجروحین کی مرہم پٹی کی اور ان کا علاج کیا، نیز راسٹلی لکھتے ہیں۱۔

"در بارۂ غیاث الدین تغلق	غیاث الدین تغلق کے بارہ میں بیان کیا جاتا
مذکور است کہ وی چوں در مقابل خسرو خان	ہے کہ جب اس نے خسرو خان کے مقابلہ میں فتح
پیروز گردید، مجروحان دشمن را خود ش	پائی تو دشمن کے زخمیوں کا خود علاج معالجہ
درمان و معالجہ و پرستاری نمود، در میں	کیا، ان مجروحین میں ایک آدمی تمر نام کا تھا،
ایں مجروحین مردی بود، تمر نام غیاث الدین	جس کے زخموں کی مرہم پٹی خود غیاث الدین
تغلق زخمہائش را بدست خود بست و مرہم	تغلق نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی، امیر خسرو
نہاد، امیر خسرو در ایں بارہ می گوید۲	اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔
بدستِ خود جراحتہاش می بست	دوا با مہر راحتہاش می بست

غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمود عادل تغلق شاہ معروف بہ محمد بن تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) سریر آرائے سلطنت ہوا، یہ نہایت صاحب علم و فضل بادشاہ تھا، اور جملہ علوم و فنون کے ساتھ علم طب سے بھی گہری واقفیت رکھتا تھا، بالخصوص معالجات امراض میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی، کثیر التعداد مریض اس کے علاج سے شفایاب ہوئے، وہ اکثر و بیشتر ماہرین فن اطباء سے طبی مسائل میں بحث و مباحثہ بھی کرتا تھا، اور اپنے خیالات کی صحت و صداقت کا ان کو قائل بنا دیتا تھا۳،

محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) تخت نشین ہوا، اسے مذہبی علوم کے علاوہ

۱؎ تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، ص ۱۱، ۲؎ تغلق نامہ، ص ۱۰۲ ۳؎ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۶۳، ۴۶۴۔

طب اور علم ہیئت میں بھی مہارت حاصل تھی، اس کی لائبریری میں ان علوم سے متعلق کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، علم طب سے اس کی دلچسپی اور واقفیت کا بدیہی ثبوت "طب فیروز شاہی" ہے، جس میں ان امراض کے علاج لکھے ہوئے ہیں جو "قانون شیخ" اور "ذخیرۂ خوارزم شاہی (اسماعیل جرجانی) میں بھی مذکور نہیں ہیں، وہ استخوان شکستہ کے جوڑنے میں مہارت رکھتا تھا، چنانچہ مختلف مہمات میں اس نے لوگوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو حیرت انگیز طور پر درست کر دیا، وہ امراض چشم کا بھی ماہر تھا، اس نے ایک ایسا سرمہ ایجاد کیا تھا، جو متعدد امراض چشم میں نہایت نافع ثابت ہوا، یہ سرمہ کحل فیروز شاہی کے نام سے معروف تھا۱،

عہد لودی میں بھی طب یونانی کو بڑا فروغ نصیب ہوا، سکندر شاہ لودی (متوفی ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) نہایت صاحب علم و فضل اور دور اندیش بادشاہ تھا، وہ فارسی زبان سے گہری واقفیت رکھتا تھا، اور فارسی میں شاعری بھی کرتا تھا، گل رخ اس کا تخلص تھا، موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، "گنجینۂ سکندر شاہی" اس کا واضح ثبوت ہے، اسے طب سے غیر معمولی شغف تھا، چنانچہ اس نے اپنے ذی علم وزیر میاں بہوا ابن خواص خاں کو حکم دیا کہ وہ ہندی طب (آروید) کے اصول و نظریات اور طریقۂ علاج پر مشتمل ایک کتاب تالیف کرے، تعمیل حکم میں بہوا ابن خواص خان نے معروف درباری اطباء کی مدد سے "معدن الشفا سکندر شاہی" نام کی کتاب تالیف کی، جس پر مزید گفتگو آگے آرہی ہے۔۲

سکندر لودی کے ایک دوسرے وزیر امیر میاں طٰہٰ اسلامی علوم کے ساتھ طب ہندی اور موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ہندی طب سے متعلق ۲۴ ہزار اشلوک انھیں زبانی یاد تھے، اس فن میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ خود ہندو ماہرین طب ان سے طب ہندی کا درس لیا کرتے تھے۔۳

۱؎ سیرت فیروز شاہی (مخطوطہ بانکی پور لائبریری، پٹنہ) فصل ۴، اوراق ۱۶۱-۱۷۶، دیکھیں، کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین مینسکرپٹ، بانکی پور لائبریری، جلد ۴، ص ۲۸، ۳۳ ۲؎ یہ کتاب (صفحات ۴۹۲) منشی نولکشور پریس سے ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوچکی ہے۔ ۳؎ تاریخ مشتاقی (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اوراق ۶۹ (ب) تفصیل کے لیے دیکھیں اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (ڈاکٹر زبیر صدیقی) کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۵۹ء، ص ۳۹

تصانیف ماقبل عہد مغلیہ میں علم طب سے متعلق متعدد اہم اور نادر کتابیں لکھی گئیں، جن کے مطالعہ سے اس دور میں طب کی ترقی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس دور کی چند معروف طبی کتابوں کا یہاں اختصار کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) طب فیروز شاہی :۔ اس کتاب کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔

(۲) راحت الانسان :۔ اس کتاب کا مولف الیاس بن شہاب ملقب بہ ضیا ہے، یہ ۷۸۶ھ میں مرتب کی گئی، اور فیروز شاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔[۱]

(۳) مجموعۂ شمسی :۔ یہ خواجہ شمس الدین مستوفی کی تالیف ہے، مولف نے اسے سنسکرت کتابوں کی مدد سے لکھا ہے، اس کے زمانۂ تالیف اور دوسرے متعلقہ امور کے بارہ میں کچھ علم نہیں ہو سکا، اس کے متعلق معلومات کا تنہا ماخذ عہد تغلق کے معروف طبیب حکیم ضیا محمد کی کتاب "مجموعۂ ضیائی" ہے۔ ضیا محمد نے اس کتاب کے مقدمہ میں مجموعۂ شمسی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"دریں سال نوبت زحمت دو بار بود چنانچہ بیشتر آدمیان کہ در صحبت این بندہ بودہ اند برحمت حق پیوستند و بندہ را مدت دو سال و چہار ماہ بانواع زحمت مستولی بود و ہر لحظہ و ہر لمحہ طبیبان ماہر را حال خود باز نمودہ می شد و ہر چہ می گفتند علاج کردہ می آمد تا گران زحمت بصحت انجامد و در دل بیارامد، ہیچ سبیل فائدہ نبود بلکہ ہر روز زحمتے مزید

یہ ایسی بیماری دوبا کا سال تھا کہ بہت سارے لوگ بیمار ہو کر انتقال کر گئے، میں دو سال چار ماہ تک طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہا، ہر وقت اپنا حال ماہر اطبا سے بیان کرتا، اور وہ جو کچھ کہتے، اس کے مطابق علاج کرتا، لیکن کسی طرح افاقہ نہ ہوتا بلکہ روزانہ کسی نئی بیماری میں مبتلا ہوتا رہا، ایک رات صبح کے قریب اللہ تعالے کے حضور میں نالہ و فریاد کر رہا تھا کہ اسی رات میں

[۱] جرنل اسٹڈی ان ہسٹری آف میڈیسن ج ۳ نمبر ۲ جون ۱۹۷۹ء ص ۱۲۸ (ہمدرد نگر، دہلی)

و علتے مستزید می شد تا شبے بصبح دمے در حضرت عزت کہ شفا بخش دردمندان و علیلان بنالیدم ہماں شب عم خویش خواجہ شمس مستوفی را بخواب دیدم کہ می گوید من کتاب جمع کردہ ام در طب مجموعۂ شمسی نام و تو درین کار ذوق داری آں را پیش گیر و دوائے خویش ساز تا حق تعالے ترا صحت بخشد۔"[۱]

اپنے چچا خواجہ شمس مستوفی کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ میں نے طب میں مجموعۂ شمسی کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے، تمہیں اس کی واقفیت ہے، اسے پیش نظر رکھو، اپنا علاج کرو، اللہ تعالے شفا دے گا۔

(۴) مجموعۂ ضیائی :۔ اس اہم طبی کتاب کا مولف ضیا محمد محمود مسعود رشید زنگی عمر غزنوی معروف بہ مبارکباد ہے، یہ محمد تغلق (متوفی ۱۳۵۱ء) کا درباری طبیب تھا، عربی اور فارسی کے ساتھ سنسکرت زبان سے بھی پوری واقفیت رکھتا تھا، محمد ضیا نے اس کتاب کو تلنگ (دیوگری یا دولت آباد) کے زمانۂ قیام میں لکھا تھا، جہاں وہ سلطان کے حکم سے شہر دلی کے دوسرے ارباب کمال کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا، ضیا محمد نے منتقلی کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

می گوید بندۂ ضعیف اضعف العباد ضیا محمد محمود مسعود رشید زنگی عمر غزنوی عرف مبارکباد کہ در شہور سنہ سبع و ثلثون و سبع مأۃ بحکم فرمان خداوند عالم المخصوص بعنایۃ الرحمن ابو المجاہد محمد بن تغلق شاہ سلطان کہ بانفع صور جاری مادر سیدم در شہر سلطان کہ

بندہ ضعیف ضیا محمد محمود مسعود رشید زنگی عمر غزنوی عرف مبارکباد عرض کرتا ہے، کہ ۷۳۷ھ میں شہنشاہ محمد بن تغلق کے فرمان کے مطابق ہم لوگ اس کے شہر تلنگ میں پہنچے، یہ بہت بڑا، زرخیز، دلکش اور خوشنما شہر تھا، جس میں انواع و اقسام

[۱] اے کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین میڈیکل مینسکرپٹ، آئی، ایچ، ایم، آر، ہمدرد نگر دہلی، مخطوطہ نمبر ۱۱۹۶۳

آں را تلنگ گویند، دیدم شہرے معظم، د — کی نعمتیں اور میوے تھے، نیز اس شہر میں

سوادے خوش و ولایتے دل کش نعمتہائے — حوض اور نہریں تھیں۔

فراوان و میوہ ہائے بے پایان، و درون

شہر حوضہا و جویہائے آب رواں"[1]

یہ کتاب فارسی میں ہے، اور اس کا سنہ تالیف ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء ہے، محمد ضیاء نے اس کتاب میں یونانی دواؤں کے ساتھ آرویدِ طریقۂ علاج اور ادویہ کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اعمال سرجری اور سونا و چاندی اور تانبہ سے کشتہ سازی کے طریقوں کے علاوہ بسلسلۂ علاج علم نجوم اور علم ہیئت سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے، (فصل ۴۰، ۴۱، ۴۲) ایک فصل (۴۶) گھوڑوں کے علاج سے متعلق ہے

اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد تغلق کے اطباء علاج و معالجہ میں طب یونانی کے ساتھ آرویدِ طریقۂ علاج سے بھی استفادہ کرتے تھے، جس سے طب یونانی کے معالجاتی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہوا، یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری (حیدرآباد دکن) اور دوسرا نسخہ میڈیکل لائبریری (ہمدرد نگر، دلّی) میں محفوظ ہے۔

(۵) طب شہابی و طب شفاء الخانی :- یہ دونوں کتابیں مظفر خاں اوّل ملقب بہ مظفر شاہ کے عہد میں لکھی گئیں، ان کے مولف کا نام شہاب الدین عبدالکریم ناگوری ہے، انھوں نے ان کتابوں کی تالیف میں عربی و فارسی کی طبی کتابوں کے علاوہ سنسکرت کتابوں سے بھی مدد لی ہے، ان میں بعض دواؤں کے نام سنسکرت اور سندھی میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔

اوّل الذکر یعنی طب شہابی[2] جس کا دوسرا نام شفاء المرض بھی ہے، ایک منظوم طبی رسالہ ہے، اس کا

---

[1] اے کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین میڈیکل مینسکرپٹ، ہمدرد نگر، دہلی، مخطوطہ نمبر ۱۱۹۶۳

[2] یہ منظوم رسالہ حکیم ٹیکم داس طبیب و وید اور مولوی اختر خان کے زیر اہتمام ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ مناسب تصحیح و تنقیح کے بعد اسے دوبارہ شائع کیا جائے، کیونکہ طبع اول اغلاط سے پر ہے، اور کتابت و طباعت بھی کتاب کے شایان شان نہیں ہے۔ (الطاف)

سنہ تالیف ۸۹۰ھ ہے، اس میں بقول مولف انہی دواؤں کا ذکر ہے، جو تجربہ کی کسوٹی پر پوری اتر چکی ہیں، اس منظوم رسالے میں جملہ جسمانی امراض کے اسباب، علامات اور ان کے علاج کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، بعض دواؤں اور غذاؤں کے خواص و افعال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اخیر میں "کیفیت حال خود" کے عنوان سے مولف نے اپنی سرگذشت حیات بیان کی ہے، اس میں بعض باتیں دلچسپ بھی ہیں، اور عبرت انگیز بھی، بالخصوص مولف کے وہ تاثرات جو ہندوں اور مسلمانوں کے طرز فکر و عمل سے متعلق ہیں، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :-

ز ہندو وفا در جہاں یافتم — ز مسلم جفا از خدا خواستم

نہ کافر مراد او گنجے نہاں — کہ در مالِ من شد ز مسلم زیاں

و لیکن چو رنجی بہ ہندو شود — نیز زد اطبائے واثق رود

ز فرمانِ او بر نتابد عناں — ز پرہیز دارد دگر غیر آں

پس از چند روزے چو بہتر شود — ہمہ عمر مولائے آں در شود

با تمنائے دارد بمیرد اگر — نوازش کند خدمتِ بیشتر

کہ تا دسترس طاقت ازیں مرد بود — پئی صحتِ او چہ کوشش نمود

و لیکن چو تقدیر پروردگار — در آمد نیامد دوائے بکار

چوں رنجی بمسلم در آید بتن — بیارند پیشاب آں سوئے من

ز بہر خدا گویم از جان و دل — دوائی مجرب و پرہیز آں

اگر شہد گویم خورد دوغ را — برنج ار بگویم خورد شوربا

اگر زیست گویند فضل حبیب — دگر مرد گویند کشتہ طبیب

دریں خطہ اسلام را حال نیست — ندانم کہ جائی دگر حال چیست

موخر الذکر کتاب یعنی طب شفاء الخانی فارسی نثر میں ہے، اس کی تالیف ۹۴۲ھ میں ہوئی ہے۔

اس میں سب سے پہلے اعضاء کی تشریح اور ان کے منافع بیان کیے گئے ہیں، پھر امراض، اسباب اور طریقۂ تشخیص و علاج پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد مجرب نسخے بیان کیے گئے ہیں، ان نسخوں میں وہی دوائیں شامل کی گئی ہیں، جو آسانی کے ساتھ مل جاتی ہیں، دواؤں کے عربی اور فارسی نام کے ساتھ ان کے مترادف ہندی نام بھی دیئے گئے ہیں، اس کے علاوہ کتاب میں وہی دوائیں لکھی گئی ہیں، جو کم قیمت ہیں تاکہ غرباء بھی آسانی کے ساتھ انھیں خرید سکیں۔

۶۔ الکلیات والجزئیات :۔ اس کتاب کے مولف شیخ ضیاء الدین نخشبی (متوفی ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) ہیں، یہ بدایوں کے باشندہ تھے، اس کتاب میں انھوں نے یونانی دواؤں کے ساتھ ان دواؤں کے ذکر کا بھی التزام کیا ہے، جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں۔

۷۔ شفاء محمودی :۔ یہ مشہور ہندی طبیب واگ بھٹ کی مشہور کتاب "اسٹنگ ہردے" کا فارسی ترجمہ ہے، مترجم کا نام علی بن محمد بن اسماعیل اسادلی اصیلی[۱] ہے، گجرات کے فرماں روا سلطان محمود شاہ[۲] (متوفی ۱۵۱۱ء/۹۱۷ھ) نے عربی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے فارسی ترجمہ کے لیے ایک محکمہ قائم کیا تھا، واگ بھٹ کی مذکورہ کتاب کا ترجمہ اسی محکمہ کے تحت اس کے حکم سے کیا گیا تھا۔

۸۔ معدن الشفاء سکندر شاہی :۔ اس کتاب کے مولف میاں بھوا[۳] ابن خواص خاں ہیں جن کا تذکرہ

[۱] یہ طبیب حیدرآباد سندھ (پاکستان) کا رہنے والا تھا، [۲] محمود شاہ کو محمود بیگڑا بھی کہا جاتا ہے، یہ سلطان احمد شاہ بانی احمد آباد کا پوتا تھا، اس نے ۵۴ سال تک گجرات پر نہایت عدل و امن کے ساتھ حکومت کی، تفصیل کے لیے دیکھیں فرشتہ ج ۲ ص ۱۹۳-۲۰۵، منشی نولکشور پریس کانپور ۱۸۸۴ء [۳] ان کے والد خواص خاں ان کو پیار سے بھوا کے نام سے بلاتے تھے، اور بالآخر یہی ان کا نام پڑ گیا، میاں بھوا بن خواص خاں سکندر شاہ لودی کے عہد میں ممتاز مناصب پر فائز رہے، مثلاً حاجب خاص، میر عدل (چیف جسٹس) اور وزیر اعظم وغیرہ، سلطان نے ان کے غیر معمولی علم و فضل کی وجہ سے انھیں مسند علی کے خطاب سے نوازا تھا، دیکھیں، اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (ڈاکٹر زبیر صدیقی) ص ۹۰۔

پہلے ہو چکا ہے، انھوں نے ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں سکندر شاہ کے حکم سے درجنوں سنسکرت کتابوں بالخصوص چرک اور شسرت کی مدد سے اس کتاب کو تالیف کیا اور اسے بادشاہ کے نام معنون کیا، فی الواقع یہ کتاب طب ہندی سے متعلق سنسکرت لٹریچر کا خلاصہ ہے[۱]۔

شفاخانے ماقبل عہد مغلیہ میں مختلف شہروں میں بہت سے شفاخانے قائم تھے، ایلیٹ کے بیان کے مطابق محمد بن تغلق کے عہد میں تنہا دلی شہر میں ۷۰ اسپتال موجود تھے[۲]، فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں چند مزید شفاخانوں کا اضافہ کیا، فرشتہ لکھتا ہے۔

"بادشاہ نے ۵۰ ڈیم، چالیس مسجدیں، ۳۰ دار العلوم، ۲۰ خانقاہیں، ۱۰۰ محل، ۵ اسپتال، ۱۰۰ مقبرے، ۱۰ حمام، ۱۵۰ کنویں اور ۱۰۰ پل بنوائے اور بکثرت باغ لگوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے عطیات مقرر کیے[۳]۔"

فیروز شاہ نے فتوحات میں ایک اسپتال کا ذکر کیا ہے، اس میں ہر طرح کے مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا، اور اس مقصد کے لیے تجربہ کار اطباء متعین تھے[۴]۔

عفیف نے فیروز شاہ کی طب سے دلچسپی اور مریضوں سے دلی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"بادشاہ نے مریضوں کے علاج کے لیے ایک اسپتال بنوایا تھا جس میں بلا امتیاز حسب نسب، سب کا علاج کیا جاتا تھا، اس میں فاضل اطباء مقرر کیے گئے تھے، بادشاہ کا حکم تھا کہ جیسے ہی کوئی مریض آئے فوراً اس کا معاینہ کیا جائے، اور اس کی مرض کی صحیح صحیح تشخیص کرکے موزوں دوائیں دی جائیں اور مریضوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے، اس میں عام اطباء کے

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر، ص ۹۶-۱۰۶ [۲] ایلیٹ اینڈ ڈاسن ج ۳ ص ۵۷۶ [۳] تاریخ فرشتہ، ج ا ص ۱۵۱ (نولکشور ۱۸۶۴ء) [۴] فتوحات فیروز شاہی صفحہ ۱۵-۱۶۔

علاوہ خاص خاص بیماریوں کے ماہرین، سرجن اور امراض چشم کے ماہرین، قابلات اور دوسرے خدمت گار متعین تھے، مریضوں کو غذا اور دوا دونوں مفت فراہم کی جاتی تھیں، مریض صحت یاب ہونے کے بعد خدا کا شکر بجا لاتے اور نماز تشکر ادا کرتے تھے، اور ساتھ ہی خدا سے سلطان کی درازئ عمر اور خوش اقبالی کی دعائیں مانگتے تھے، اور خوشی خوشی اپنے گھروں کو جاتے تھے، سلطان نے اس اسپتال کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بہت سے دیہات وقف کر دیئے تھے، جن کی سالانہ آمدنی ۳۶ لاکھ تنکہ تھی[1]۔

مولف "سیرت فیروز شاہی"[2] نے چوتھے باب میں ان تمام مفرد اور مرکب دواؤں کی تفصیلات دی ہیں، جو اسپتال میں موجود رہتی تھیں، اور جن سے سر سے پیر تک کے امراض کا علاج کیا جاتا تھا، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ خود ان اسپتالوں کا معائنہ کرتا تھا، اور مریضوں کے لیے نسخے تجویز کرتا تھا، بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ مجنونوں کو پکڑ کر پابہ زنجیر اس اسپتال میں رکھا جائے اور اس کی تجویز کردہ دواؤں سے ان کا علاج کیا جائے، چنانچہ اس قسم کے مریضوں کو اسی کی تجویز کردہ دوائیں اور غذائیں دی جاتی تھیں[3]، اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے مریضوں کے علاج کے لیے جو اسپتال قائم کیے تھے، ان میں حاذق اطباء مریضوں کا علاج کرتے تھے[4]۔

سطور بالا میں ماقبل عہد مغلیہ میں طب یونانی کی ترقی کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ مغل سلاطین کی آمد سے بہت پہلے ہندوستان میں طب یونانی نہ صرف رائج تھی بلکہ اس کی بنیادیں کافی مستحکم ہو چکی تھیں۔

---

[1] عفیف شمس سراج، تاریخ فیروز شاہی، پندرہواں مقدمہ، ص ۳۴۴، حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء۔

[2] یہ کتاب سلطان فیروز شاہ کے عہد میں ۷۷۲ھ میں لکھی گئی، تفصیل کے لیے دیکھیں عبدالمقتدر، کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین مینسکرپٹ، ج ۷، ص ص ۲۸-۳۳، بانکی پور لائبریری [3] سیرت فیروز شاہی (مخطوطہ بانکی پور لائبریری)، نمبر ۵۴۷، اوراق ۱۶۱-۱۷۰ [4] ایضاً اوراق ۱۱۸

ادبیات

غزل

از چندر پرکاش جوہر بجنوری الٰہ آباد

رخِ دلدار سے یا کوئے بتاں سے اٹھّے
فتنہ ہر حال میں فتنہ ہے جہاں سے اٹھّے

کتنے جاں سوز و دلآویز ہیں وہ نغمے
شعلہ بن کر جو مرے حسنِ بیاں سے اٹھّے

دونوں عالم میں کہیں ان کو ٹھکانا نہ ملا
جو تری بزم سے اٹھّے وہ جہاں سے اٹھّے

ہائے وہ نالے کہ جو عرشِ بریں تک پہونچے
اُف وہ طوفاں جو مرے اشکِ رواں سے اٹھّے

کششِ حسن نے اک گام بھی چلنے نہ دیا
پھر وہیں بیٹھ گئے لوگ جہاں سے اٹھّے

کام کچھ کر نہ سکا واعظِ ناداں کا طلسم
کتنے طوفان مری خاموش فغاں سے اٹھّے

ان حجابات کی عظمت کو کہوں کیا جوہر!
جو یقین بن کے مرے وہم و گماں سے اٹھّے

غزل

از

وارثؔ ریاضی، ایم۔ اے مغربی چمپارن

کبھی تو میری جانب التفاتِ یار ہو جائے
کہ بحرِ غم سے میری کشتیِ دل پار ہو جائے

تری چشمِ کرم ساقی اگر اک بار ہو جائے
فروغِ مے سے دل "میخانۂ انوار" ہو جائے

وہ مے کش کیا جو ہو بیگانۂ آدابِ میخانہ
وہ کیا ساقی ہے مے خواروں سے جو بیزار ہو جائے

الجھنا اپنے ہم جنسوں سے حیوانوں کی خصلت ہے
وہ انساں کیا جو باہم برسرِ پیکار ہو جائے

سکونِ دل میسر ہے جسے ان کے تغافل سے
نگاہ لطف ہو تو زندگی دشوار ہو جائے

....

نہ آیا عمر بھر کوئی بھی "حرفِ آرزو" لب پر
کہیں ایسا نہ ہو برہم مزاجِ یار ہو جائے

پگھل کر گا ہے گا ہے موم ہو جاتا ہے پتھر بھی
تعجب کیا جو شاخ گل کبھی تلوار ہو جائے

یہ شامت ہے حقیقت میں برے اعمال کی ورنہ
مسلماں اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائے

کوئی کچھ بھی کہے لیکن کبھی ممکن نہیں وارثؔ
زبانِ شوق سے شرحِ جمالِ یار ہو جائے

مطبوعات جدیدہ

تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرۂ ملی تعلیمات نبویؐ: مرتبہ جناب حکیم محمد سعید صاحب تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، بہترین ٹائپ، صفحات ۱۱۲ مع خوبصورت ٹائٹل، قیمت: سو روپے، ناشر ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی ۱۸۔

حکیم حافظ محمد سعید صاحب کی سرگرمی و فیض رسانی کا دائرہ بہت وسیع ہے، انکی مستعدی، ہمت عالی، جذبہ خدمت اور جوش عمل کی بدولت پاکستان میں گوناگوں مفید علمی، تعلیمی، دینی، اصلاحی، تعمیری، قومی اور ملی کام انجام پا رہے ہیں، ان کو ملک بیرون ملک کے متعدد بین الاقوامی سمیناروں اور عظیم الشان کانفرنسوں میں شرکت کا موقع بھی ملتا ہے، اور وہ خود بھی کئی اہم بین الاقوامی اجتماع اپنی نگرانی و اہتمام میں بڑی خوش اسلوبی سے کرا چکے ہیں، انکے دردمند دل میں دین و مذہب، قوم و ملت اور ملک و وطن کی پرخلوص ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ بھی موجزن ہے اور وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور دین کے احیا و سربلندی کے لیے نہایت فکرمند بھی رہتے ہیں، اسی لیے وہ پاکستان کو نظری، فکری اور عملی حیثیت سے ایک اسلامی ریاست بنانے کی مخلصانہ جدوجہد میں برابر سرگرم اور متحرک نظر آتے ہیں، ۱۴۰۲ھ کی تیسری ہمدرد سیرت کانفرنس اسی سلسلہ کی کڑی ہے، یہ پنج روزہ کانفرنس تصور ریاست اسلامی کے موضوع پر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان میں بڑی کامیابی سے ہوئی تھی، زیر نظر کتاب اس میں پڑھے گئے اردو مقالات کا مجموعہ ہے، ان مقالات میں اسلامی ریاست کے خط و خال کو نمایاں کیا گیا ہے، اور اس کے تصورات و نظریات اور اہم عناصر و اجزا کی وضاحت کی گئی ہے، نیز اس کے طرز حکومت، طریقہ انتخاب، داخلی و خارجی مسائل، قومی و بین الاقوامی امور، ذمہ داریوں اور فرائض پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس کے پہلے اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید

اور تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا گیا ہے، دوسرے حصہ کے ایک مضمون میں ریاست مدینہ میں پیغمبر اسلامؐ کے چند انتظامی اقدامات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد اسلامی ریاست کے بنیادی تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے، چوتھے حصہ میں اسلامی ریاست کے آئین، طرزِ حکومت، طریق انتخاب، امیر کے تصور و انتخاب اور حکام کے اوصاف وغیرہ کا ذکر ہے، ایک حصہ میں اسلامی ریاست کے ان تصورات و نظریات پر بحث و تبصرہ ہے، جو علماء و مفکرین نے تحریر کئے ہیں، اس ضمن میں امام سرخسی، شیخ محمد عبدہ، مولانا عبید اللہ سندھی، ڈاکٹر اقبال، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار کی روشنی میں اسلامی ریاست کے خط و خال بیان کیے ہیں اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی اسلامی تحریک کی خصوصیات و اثرات دکھائے ہیں، آخر میں اسلامی ریاست کے مختلف پہلوؤں پر مضامین درج ہیں جن میں بین الاقوامی قانون، معاشی فرائض، نظامِ تعلیم و تربیت، سائنس و ٹکنالوجی کی اہمیت، ذرائع ابلاغ کے کردار، نوجوانوں، آجر و اجیر، علم و علماء مسجد، سیاست اور تجارت کا مقام واضح کیا گیا ہے اور معاشرہ، افراد، سیاسی جماعتوں کی نوعیت اور قائد اعظم کے تصور پاکستان کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ مجموعہ تمام پاکستانی فضلا اور ماہرین قانون کی نگارشات پر مشتمل ہے، ہندوستان کی نمائندگی تنہا جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دار المصنفین نے کی ہے، اُن کا فاضلانہ مضمون "تصور ریاست اسلامی" لائق مطالعہ ہے، گو سب مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں اور نہ سب کے تمام مندرجات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، جیسے ایک مضمون میں کہا گیا ہے "اسلامی ریاست کا تصور قطعی جمہوری ہے اور اس کی بنیاد حکومت میں عوام کی شرکت ہے" (صفحہ ۱۸۳) اسی مضمون میں موجودہ طرزِ انتخاب کو جو اس وقت جمہوری ملکوں میں رائج ہے، عین اسلامی بتایا گیا ہے۔" (صفحہ ۱۷۹) یہ دونوں باتیں کلیۃً درست نہیں ہیں، خود اس مجموعہ کے اکثر مضامین میں انکی تردید موجود ہے، صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۰ پر جلیل القدر اور کبار صحابہ کیلئے کبائر کا لفظ استعمال کیا ہے جو درست نہیں، کبائر کبیر کے بجائے کبیرہ کی جمع ہے جو اردو میں بڑے گناہوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تاہم اکثر مضامین مفید اور معلوماتی ہیں اور ان سے اسلامی ریاست کے تصورات، اس کی نوعیت و ہیئت، خط و خال، حدود و شرائط، فرائض اور ذمہ داریاں وغیرہ پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں، حکیم صاحب نے اس مجموعہ کو سلیقہ و اہتمام سے شائع کر کے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے، جس کیلئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

انفاس العارفین: مترجم جناب سید محمد فاروق قادری صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۱۰، قیمت ۴۰ روپے۔ مکتبۃ الفلاح دیوبند۔ یو۔پی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی و دینی یادگاروں میں انفاس العارفین اس لحاظ سے بڑی اہم تصنیف ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے ذاتی اور خاندانی بزرگوں اور اساتذہ و مشائخ کے حالات اور علمی و روحانی کمالات قلمبند کیے ہیں، یہ تصنیف لطیف دراصل سات حصوں پر مشتمل ہے، اس کے بعض حصے علحدہ اور بعض شاہ صاحب کی دوسری تصنیفات کے ساتھ بھی چھپے ہیں اور یہ مکمل کتاب بھی چند بار شائع ہو چکی ہے، اس کو شاہ صاحب نے اپنے دور کی علمی زبان فارسی میں لکھا تھا، جس کا اب رواج نہیں رہا، اس لیے جناب سید محمد فاروق صاحب نے عام فائدے کے لیے انفاس العارفین کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، اس کے پہلے حصہ بوارق الولایت میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کے سوانح، روحانی تصرفات، مکاشفات اور اقوال و ملفوظات قلمبند کئے ہیں، پہلے ان کے پیر و مرشد خواجہ حافظ سید عبد اللہؒ اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے فرزند حضرت خواجہ خوردؒ کا تذکرہ ہے، اس کے بعد شیخ ابوالقاسم اکبر آبادیؒ کے واقعات و کمالات کا ذکر ہے، جن کی جانب شاہ عبد الرحیمؒ حضرت خواجہ حافظ سید عبد اللہؒ کی وفات کے بعد رجوع کرتے تھے، انکے ضمن میں میر ابوالعلیؒ کے حالات و کمالات اور سلسلہ ابوالعلائیہ کی خصوصیات بھی تحریر کی گئی ہیں، ان دونوں کے علاوہ شاہ عبد الرحیمؒ کی اپنے زمانہ کے دوسرے مشائخ و اولیا اور مجاذیب سے ملاقاتوں اور ان سب کی ان کی جانب خاص توجہ کے متعدد واقعات لکھے ہیں، اور پھر شاہ عبد الرحیمؒ کے کشف و کرامات اور تصرفات کا مفصل حال بیان کیا ہے، اور آخر میں ارشادات و ملفوظات نقل کئے ہیں، دوسرے حصہ شوارق المعرفۃ میں شاہ صاحب نے اپنے عم بزرگوار حضرت شیخ ابوالرضا محمدؒ کے حالات، باطنی کمالات اور ملفوظات درج کئے ہیں، اس کے آخر میں شیخ ابوالرضا، اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے پوتے اور نامور بزرگ حضرت شیخ عبد الاحدؒ کے ایک دوسرے کے نام کے مکاتیب دئے ہیں جو بڑی اہمیت کے

حال ہیں، یہ دونوں حصے زیادہ اہم ہیں اور کتاب کا بڑا حصہ انہی پر مشتمل ہے، ان دونوں میں گوناگوں عالمانہ و عارفانہ نکات و اسرار اور تصوف و سلوک کے حقائق و لطائف قلمبند کیے گئے ہیں، تیسرا حصہ الامداد فی مآثر الاجداد ہے۔ جو شاہ صاحب کے اجداد کا تذکرہ ہے، اس میں انھوں نے اپنا نسب نامہ بھی بیان کیا ہے، ایک حصہ النبذۃ الابریزیہ فی اللطیفۃ العزیزیہ ہے، اس میں اپنے والد کے نانہالی جد اعلیٰ شیخ عبد العزیز دہلویؒ اور انکے اسلاف و اخلاف کے حالات تحریر کیے ہیں، ایک اور حصہ العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیہ میں اپنے جد مادری حضرت شیخ محمد پھلتیؒ کے احوال و مناقب اور کرامات بیان کیے ہیں، چھٹے حصہ کا نام انسان العین فی مشائخ الحرمین ہے، اس میں شاہ صاحب نے حرمین کے اپنے اساتذہ و مشائخ کے حالات و واقعات دیے ہیں، آخری حصہ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف حضرت شاہ صاحب کے خود نوشت حالات پر مشتمل ہے، انکا خاندان علمی و دینی حیثیت سے بہت ممتاز تھا، مگر شاہ صاحب کی عظمت و شہرت کے سامنے دوسرے بزرگوں کی شہرت و عظمت ماند پڑ گئی تھی، اس کتاب سے اس خانوادہ کے مختلف بزرگوں کے علمی و باطنی کمالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس حیثیت سے اس کم یاب کتاب کے اردو ترجمہ کی اشاعت پر مترجم و ناشر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں، لائق مترجم نے جابجا مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں، شروع میں انکے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں شاہ صاحب کے حالات و کمالات تحریر کیے ہیں، اور انفاس العارفین کا تعارف کرایا ہے، اس سے انکی عظمت اور انکے اہل خاندان کے تصوف میں کمال و امتیاز کا پتہ چلتا ہے، مقدمہ میں ان لوگوں کا تعاقب بھی کیا ہے جنھوں نے شاہ صاحب کے تصوف میں درجہ و مرتبہ کو نظر انداز کر کے انکی صوفیانہ تصنیفات کی جانب سے بے اعتنائی کی ہے لیکن اس سلسلہ میں ان کا لب و لہجہ تیز ہو گیا ہے، اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور انکی مقبول ترین تصنیف تقویۃ الایمان کا ذکر نا مناسب انداز میں کیا ہے، گویا جس انتہا پسندی کی مترجم کو دوسروں سے شکایت ہے، اس میں وہ خود بھی مبتلا ہو گئے ہیں، انفاس العارفین کو نظر انداز کرنے کی شکایت بھی بیجا ہے، دراصل شاہ صاحب کی خارق عادت ذہنی و عملی کمالات کا اصل ثبوت اور زیادہ اہم بالشان کارنامہ ان کی اصلاحی و تجدیدی تصانیف ہیں جن سے انکی صحیح عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، اسلئے انکی جانب بجا طور پر زیادہ اعتنا کیا گیا، انفاس العارفین کے بعض مباحث کا فہم و ادراک بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مشکل ہے، اس لیے کلموا الناس علی قدر عقولہم کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

فتاویٰ احیاء العلوم جلد اول: — مرتبہ مولوی مفتی جمیل احمد نذیری صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۵۲ مجلد قیمت درج نہیں، پتہ شعبہ نشر و اشاعت جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور۔ اعظم گڑھ۔

مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوری مرحوم جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے لائق استاذ تھے، وہ تقریباً پچپن برس تک درس و تدریس کے ساتھ جامعہ میں افتا کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، اور ان کے فتوے ماہنامہ البلاغ بمبئی میں شائع بھی ہوتے تھے، اب ان کی وفات کے بعد جامعہ کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے انکے فتاویٰ کی یہ پہلی جلد اہتمام سے شائع ہوئی ہے، جس کو جامعہ کے ایک ہونہار استاذ اور موجودہ مفتی مولوی جمیل احمد نذیری نے سلیقہ سے مرتب کیا ہے، انھوں نے شروع میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی مختصر تاریخ بھی قلمبند کی ہے، اس کے ضمن میں اس کے بانی، سابق اور موجودہ مہتمم کے سوانح اور احیاء العلوم میں فتاویٰ نویسی کی تاریخ بھی تحریر کی ہے، آخر میں صاحب فتاویٰ کا بھی مختصر تذکرہ ہے، اس جلد میں مندرجہ ذیل فقہی ابواب کے تحت فتوے درج ہیں، کتاب الایمان والکفر، کتاب الشرک والبدعات، کتاب ما یتعلق بالقرآن والحدیث والآثار، کتاب الاکل والشرب، کتاب الحظر والاباحۃ، کتاب المتفرقات، یہ سب فتوے احتیاط، تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھے گئے ہیں، جن سے مفتی صاحب کی جزئیات و فروع میں دقت نظر اور فقہ و افتا میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، گو اس مجموعۂ فتاویٰ میں عموماً قدیم طرز کے مسائل کا تذکرہ ہے تاہم جدید نوعیت کے بعض مسائل بھی آگئے ہیں، جیسے فیملی پلاننگ، نسبندی، چین والی گھڑی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم سودی رقم سے انکم ٹیکس ادا کرنا، جاسوسی کی صورتیں اور ان کا حکم، انکم ٹیکس میں چوری، پراویڈنٹ فنڈ، نماز میں مائک کا استعمال، اسقاط حمل کی دوا فروخت کرنا، ڈبل تنخواہ، بھوک ہڑتال، ریڈیو، سینما، کسٹم انسپکٹر کو رشوت دینا، حکومت کی مقرر کردہ شرحوں کے خلاف کرنسیوں کی تبدیلی، کمیشن پر چندہ کرنا، وصولی چندہ کی مخصوص مقدار پر انعام اور پنشن کا حکم وغیرہ، اس زمانہ کے مفتی کو موجودہ حالات کی نزاکتوں اور فقہا کے

اس قاعدے کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حالات کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔" زیر نظر مجموعہ میں سورہ ہود کی آیت ولا ترکنوا الی الذین ظلموا۔ الخ۔ کے موقع و محل اور سباق و سیاق کو نظر انداز کر کے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک محل نظر ہے، کفو کے مسئلہ میں مفتی صاحب کی رائے منفرد ہو گئی ہے، ان کا یہ خیال بجا ہے کہ شریعت میں ذات پات کا اعتبار نہیں لیکن یہ کفارت کے عدم اعتبار کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے ان کی یہ تحقیق بھی صحیح ہو کہ کتب فقہ میں مذکور کفو کی روایتیں ضعیف بلکہ موضوع اور ساقط الاعتبار ہیں، لیکن اس سے قطع نظر کفارت کا اعتبار عقل و مصلحت کا اقتضا اور بعض حالتوں میں ضروری ہے، اس سلسلہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے نکاح سے استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کے عقد میں کفارت کا اعتبار نہ کرنے سے جدائی ہو گئی تھی، اس لئے اس واقعہ سے مفتی صاحب کی تائید کے بجائے تردید ہوتی ہے۔

چمنستان فارسی:- از۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت۔ اندرون ملک ۱۰ روپیہ۔ بیرون ملک ۲ ڈالر، طلبہ کے لیے ۵ روپیہ۔ پتہ (۱) ڈاکٹر محمد افضال الرحمٰن خاں نکہت منزل، ہمند ف شاہجہانپور (۲) دانش محل امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

پروفیسر محمد عبد السمیع خاں نکہت شاہجہانپوری کو نثر و نظم پر یکساں دسترس ہے اور جس درجہ انھیں اردو شعر و سخن سے مناسبت ہے، اسی درجہ فارسی شعر و سخن سے بھی دلچسپی ہے چمنستان فارسی ان کے منظوم فارسی کلام مجموعہ ہے جو چھ حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ "روحانی" میں مذہبی نظمیں ہیں، دوسرے حصہ "زمانہ" میں حکیمانہ و فلسفیانہ کلام درج ہے، تیسرا حصہ سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے، چوتھا حصہ تہنیتی، تعزیتی اور سماجی نظموں پر مشتمل ہے پانچویں حصہ میں غزلیں اور چھٹے میں ظریفانہ کلام دیا گیا ہے، پروفیسر صاحب کی زندگی فارسی زبان کی تدریس اور اس کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، اس مجموعہ سے ان کی اس زبان سے دلچسپی و مناسبت کے علاوہ شعر و سخن کے ستھرے اور اچھے ذوق کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق اس بادۂ شیراز سے سرمست اور لطف اندوز ہوں گے۔

غالب کے خطوط جلد دوم:- مرتبہ، ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۸۶ مجلد مع خوبصورت ٹائٹل قیمت ۵، روپیہ، ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۔

اردو کے مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر خلیق انجم کو مرزا غالب اور انکی تحریروں سے بڑا شغف ہے، اور متن کی ترتیب و تصحیح کے کام کا بھی ان کو خاص سلیقہ ہے، ان موضوعات پر غالب کی نادر تحریریں "غالب اور شاہان تیموریہ" اور "متنی تنقید" کے نام سے انکی کتابیں کئی برس پہلے چھپ چکی ہیں، اب انھوں نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد غالب کے خطوط کو چار جلدوں میں مرتب کیا ہے، اسکی پہلی جلد مارچ ۸۴ء میں شائع ہوئی تھی جو ہماری نظر سے نہیں گذری، زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی دوسری جلد ہے، اس میں، ۷۹ اشخاص کے نام کے مرزا کے خطوط درج ہیں، غالب کے خطوط کے کئی مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں اور وہ مختلف کتب و رسائل میں بھی چھپے ہیں، فاضل مرتب نے ان سب دستیاب خطوط کو تلاش و جستجو کے بعد یکجا کر دیا ہے، اگر وہ اسی پر اکتفا کرتے تب بھی یہ کام کم اہم نہ ہوتا مگر انھوں نے ان مکاتیب کے ماخذ کی نشاندہی ان کے متن کی تصحیح، نسخوں کے فرق و اختلاف کی تصریح اور خطوط کے متعلق مفید محققانہ حواشی بھی لکھے ہیں جن سے انکے کام کی قدر و قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہے، اور وہ اس میں اپنے پیش روؤں سے بازی لے گئے ہیں، جن خطوط کی اصل دستیاب ہوئی ہے انکے عکسی فوٹو دیے ہیں، اور جن پر تاریخیں درج نہ تھیں تحقیق و جستجو کے بعد مختلف قرائن و شواہد سے انکی صحیح تاریخیں متعین کی ہیں، اور کہیں کہیں ان کے مندرجات کی توضیح اور اغلاط کی تصحیح بھی کی ہے، یہ مکاتیب جدید اصول تدوین کے مطابق مرتب کئے گئے ہیں، اس لیے ابتک کے دوسرے مجموعوں سے یہ مجموعہ زیادہ معیاری اور مستند ہے، اس سے غالبیات پر لائق مرتب کی وسیع نظر، متن کی تصحیح و تنقید میں مہارت اور سنجیدہ و متوازن ادبی و تحقیقی ذوق کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب اردو ادب اور غالبیات کے ذخیرہ میں مفید اور قیمتی اضافہ ہے، جس کے لیے مرتب اردو کے شیدائیوں اور غالب کے قدر دانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، کتاب صوری حیثیت سے بھی بے مثال ہے، اتنی صاف ستھری اور عمدہ کتابیں اردو میں بہت کم چھپتی ہیں، ص ۹۹، پر محمد زکریا خاں زکی دہلوی کے نام کا ایک خط درج ہے، اور ص ۸۲۱ پر محمد زکی زکی کے نام کا، جس کا عکسی فوٹو بھی دیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو اشخاص ہیں مگر متن کے ماخذ کے زیر عنوان ص ۱۰۰۸، ۱۰۰۹ پر دونوں کا جس طرح ذکر ہے، اس سے یہ دو اشخاص نہیں معلوم ہوتے۔

تاریخ ناگپور:- مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۰ روپیہ۔ پتہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ محمد علی روڈ۔ مومن پورہ ناگپور۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ ناگپور کے ایک صاحب علم وذوق شخص ہیں، انھیں تحریر وتصنیف کا بھی سلیقہ ہے، انھوں نے "ناگپور میں اردو" کے موضوع پر مقالہ لکھکر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے، زیر نظر کتاب اسی تحقیقی مقالہ کا پہلا باب ہے جو اضافہ کے بعد علحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اس میں پہلے ناگپور کی وجہ تسمیہ اور اسکی قدیم اجمالی تاریخ بیان کی ہے پھر گونڈ اور بھوسلہ خاندانوں کے مختلف راجاؤں کے دور کے مختصر حالات وواقعات اور انکے نظم حکومت وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، لائق مصنف نے دونوں خاندانوں کے حکمرانوں کا شجرہ بھی دیا ہے، اور شروع میں ناگپور کا مختصر تعارف کرایا ہے جس میں اسکے حدود اربعہ، رقبہ، آبادی اور وہاں کی تحصیلوں اور ندیوں کے نام لکھے ہیں اور پیداوار میں اناج پھلوں، لکڑیوں اور بعض معدنیات کے علاوہ وہاں پائے جانے والے جنگلی جانوروں کے نام دئے ہیں، یہ کتاب متوسط درجہ کی ہے، اور ناگپور سے متعلق بعض ضروری معلومات پر مشتمل ہے، کہیں کہیں املائی غلطیاں بھی ہیں جو ممکن ہے کتابت کی وجہ سے ہوں جیسے نسب شجرہ نصب ص ۲۰ اور علم کو الم بغاوت ص ۱۱۱ لکھا ہے۔

انتخاب کلام خسرو کاکوروی:- مرتبہ جناب مسعود انور علوی کاکوروی، تقطیع خورد، کاغذ قدرے بہتر، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۵ روپے، پتے (۱) کتب خانہ انوریہ تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری ضلع لکھنؤ، (۲) دانش محل بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ۔

نواب حسین نواز جنگ بہادر منشی معراج الدین خسرو کاکوروی (لکھنؤ) کے ایک معزز خانوادہ کے فرد اور پرگو شاعر تھے، انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، مگر انکو غزل گوئی سے زیادہ مناسبت ہے، ابھی تک انکے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، اب جناب مسعود انور علوی کاکوروی نے اس کی جانب توجہ کی اور خسرو صاحب کے چند قلمی دواوین کی مدد سے انکی غزلوں کا یہ انتخاب پہلی مرتبہ شائع کیا ہے، اسکے شروع میں مسعود صاحب کے قلم سے ایک طویل مقدمہ ہے، اس میں کاکوری کے علمی وادبی ماحول اور خسرو صاحب کے حالات کا ذکر بھی ہے اور انکی شاعری کی خصوصیات پر بحث وتبصرہ بھی ہے، زیر نظر مجموعہ کی ابتدا حمد ونعت سے ہوئی ہے اور آخر میں چند سہرے، قطعات اور رباعیات درج ہیں، درمیان کا طویل حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، جناب خسرو کا تغزل کیفیت، دلآویزی اور لطافت سے معمور ہے، اس میں تصوف کی حلاوت وشیرینی اور عشق کی مستی وسرشاری کے علاوہ زبان وبیان کی تسنگی اور بندش کی چستی بھی ہے، انتخاب خوش مذاقی سے کیا گیا ہے۔ "ض"